عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ

طلوعِ اسلام

September 39

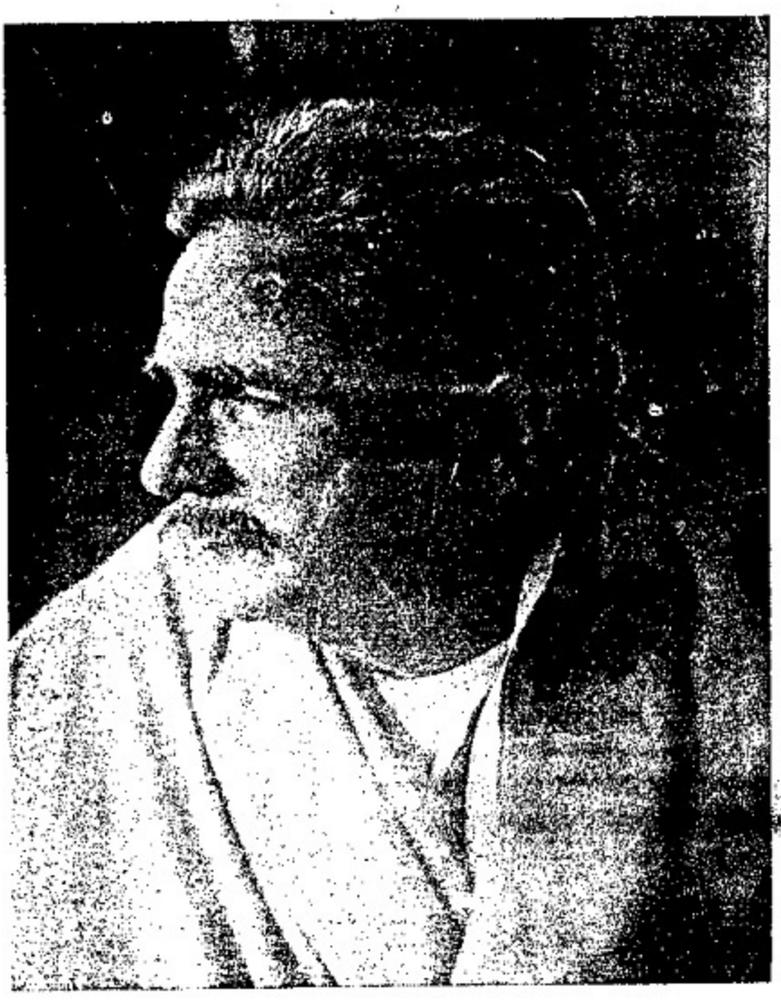

بیادگار حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

مطبوعات دائرہ طلوع اسلام

الحمدللہ کہ دائرہ طلوع اسلام کی مطبوعات نے تھوڑے ہی عرصہ میں کافی شہرت حاصل کرلی ہے۔ وارد ہا اسکیم کے تین ایڈیشن نکل چکے گفتگوئے مصالحت دوبارہ طبع کرائی گئی اس طرح دیگر رسائل بھی ہاتھوں ہاتھ نکل رہے ہیں۔ ان مطبوعات کی خصوصیت یہ ہے کہ انکا نفع کسی فرد واحد کو نہیں پہونچتا بلکہ اسکو طلوع اسلام کی ترقی اور دیگر تالیفات پر صرف کیا جاتا ہے۔

اسلامی معاشرت

مشہور متکلم اسلام مولانا غلام احمد صاحب پرویز نے اس رسالہ میں صحیح اسلامی معاشرتی زندگی کا عطر کھینچ کر رکھ دیا ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم انسانی زندگی کو کس سانچہ میں ڈھالنا چاہتا ہے اگر آپ اپنی زندگی کا نصب العین معلوم کرکے اپنی سیرت کی تشکیل قرآن کریم کی مدد سے کرنا چاہتے ہیں تو اسے ضرور ملاحظہ کیجئے قیمت ۴ر محصول ڈاک ار

وارد ھا کی تعلیمی اسکیم اور مسلمان

(از جناب رازی) اس کا چوتھا ایڈیشن بھی جو کئی ہزار کی تعداد میں چھپا تھا ختم ہو رہا ہے ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے اس کی مانگ جاری ہے۔

قیمت مع محصول ۱۰ر

سوراجی اسلام

(از جناب رازی) سیاسیاتِ ہند میں تہلکہ ڈالنے والی کتاب جس نے کانگرسی لیڈروں کے عزائم کو بے نقاب کردیا ہے، الہلال کے دورِ اول میں مولانا ابوالکلام آزاد کے خیالات کیا تھے۔ اسلامی تہذیب کو مٹانے کے لیے کانگریسیوں کا متحدہ محاذ قیمت فی نسخہ ۲ر محصول۔

زبان کا مسئلہ

(از جناب رازی۔ اس رسالہ میں نہایت شرح وبسط کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ کانگرسی اور غیر کانگرسی ہندو کس طرح اردو کو تباہ کرکے ہندی اور سنسکرت کو ہندوستان کی قومی زبان بنا رہے ہیں۔ کانگرسی حکومتوں کے سرکاری ریکارڈ سے بتایا گیا ہے کہ ہندو وزیر اردو کو برباد کرنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کر رہے ہیں قیمت ۱۰ر علاوہ محصول

دفتر طلوع اسلام بلیماران دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلامی حیات اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوع اسلام

دہلی

(دورِ جدید)

مرتب
محمد ظہیر الدین صدیقی بی ایس سی
جلد (۲) شمارہ (۵)

بدل اشتراک
ششماہی
رجب المرجب ۱۳۵۸ھ

پانچ روپیہ سالانہ
تین روپے
مطابق ستمبر ۱۹۳۹ء

فہرست مضامین

۱۔ نیشلسٹ مسلم	علامہ اقبال	۳
۲۔ لمعات	ادارہ	۴ - ۸
۳۔ پاکستان	حمید پاک	۹ - ۱۷
۴۔ قرآن اور ترتیب سُور	عبداللہ منہاس صاحب	۱۸ - ۲۰
۵۔ استدراک	ادارہ	۲۱ - ۲۲
۶۔ لامرکزیت (نظم)	اسد صاحب ملتانی	۲۳ - ۲۴
۷۔ پیغمبر محکوم "	محمد شریف صاحب چشتی	۲۵
۸۔ نادرشاہ اور اتحادِ سنی و شیعہ	مولانا حافظ محمد اسلم صاحب	۲۶ - ۴۶
۹۔ تنقید و تبصرہ	ادارہ	۴۷ - ۴۸
۱۰۔ کانگرس بے نقاب	"	۴۹ - ۷۲
۱۱۔ حقایق و عبر	"	۷۳ -

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرکزِ ملت ← لا الٰہ الا اللہ ! محمد رسول اللہ → مرکزِ ملت

فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما

مرکزی فیصلوں کی اطاعت ہی ایمان ہے

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا

اِعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا — اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ

اللہ کی رسی کو سب ملکر مضبوطی سے تھام لو اور اس سے علیحدہ مت ہو — بات مانو اللہ و رسول کی جب وہ تمہیں اس بات کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی عطا کرتی ہے

یعنی

مرکز۔ مرکز کی اطاعت اور جماعت پیدا کرو

اس لیے کہ

جو جماعت سے علیحدہ ہوا وہ جہنم میں گیا — جماعت کے بغیر اسلام کچھ نہیں !

عَلَیْکُمْ بِالْجَمَاعَۃِ فَاِنَّہٗ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِی النَّارِ — لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِالْجَمَاعَۃِ

(فرمان رسولؐ) — (قول حضرت عمرؓ)

(اقبال)

چیست ملت ایکہ گوئی لا الٰہ — با ہزاران چشم بودن یک نگاہ

بگذر از بے مرکزی پائندہ شو

نیشنلسٹ مسلم

چنیں دَور آسماں کم دیدہ باشد
کہ جبریلِ امیں را دل خراشد
چہ خوش دیرے بنا کردند آنجا
پرستند مومن و کافر تراشد

نگہبانِ حرم معمارِ دَیر است
یقینش مُردہ و چشمش بغیر است
زاندازِ نگاہِ او تواں دید
کہ نومید از ہمہ اسبابِ خیر است

(اقبالؒ)

لمعات

تحریکِ مدحِ صحابہؓ و تبرّا کے متعلق ہم پھر ایک عرصہ سے خاموش تھے۔ اسلیئے کہ ہمارا خیال تھا کہ فریقین باہمی کشاکش سے تھک چکے ہیں اور اُسکے ساتھ ہی صلح کی کوششیں بھی ہو رہی ہیں۔ لہٰذا یہ قضیۂ نامرضیہ اب خود بخود ختم ہو جائیگا۔ لیکن واقعات نے ان توقعات کی تغلیط کر دی۔ اور مناقشات کی آگ بڑھتی ہی چلی گئی۔ سب سے بڑی حیرت اس بات کی ہے کہ مسلمانوں کی اِن دو جماعتوں میں وجہ اختلاف۔ جو آج اِسقدر افتراق و مخالفت کا ذریعہ بن رہا ہے۔ کوئی نئی نہیں ہے، بلکہ مدّت ہائے دراز کی ہے جسکے باوجود یہ دونوں فرقے برابر صلح و آشتی کے ساتھ رہتے چلے آتے تھے۔ ہمارے نزدیک کسی بزرگ کی تعریف و توصیف کوئی بُرا فعل نہیں لیکن مدح صحابہؓ علی الاعلان نہ خدا نے ضروری قرار دیا ہے نہ اُسکے رسولؐ نے۔ اسی طرح تبرّا ممکن ہے کہ شیعہ مذہب کا جزو ہو مگر اس کا اعلان جس سے سُنیوں کی دِل آزاری ہو۔ کبھی جزوِ دین نہیں ہو سکتی۔ اور نہ اِسپر شیعہ حضرات کا عمل درآمد رہا ہے۔ سو ظاہر ہے کہ اسوقت معاملہ نے جسقدر طول کھینچا ہے۔ اس کی بنا رہا باہمی منافرت اور ضد پر ہے۔ جس سے ہر مسلمان کو پناہ مانگنی چاہیئے۔

اِس موقع پر ہم علّامہ حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری مدّظلہٗ کا ایک تاریخی مضمون شائع کر رہے ہیں، جس سے یہ ظاہر ہو جائیگا کہ فریقین کے اِس اختلاف کو مٹانے کے لیے آج سے بہت پہلے نادرشاہ شاہنشاہِ ایران نے کس خوبی کے ساتھ مصالحت کی صورت نکالی جس پر ایران میں آج تک عمل ہوتا چلا آرہا ہے۔ اور دونوں فریق ایک ساتھ امن و امان سے

رہتے ہیں۔ کیا عجب ہے کہ اِس تاریخی مثال سے لکھنؤ کے سُنّی اور شیعہ بھی باہمی اتحاد کی صُورت نکال سکیں ۔

بعض حضرات کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ :-

رست از یک بند تا اُفتاد در بندِ دگر

ہندوستان میں یہ حالت ہمارے مُسلم نیشنلسٹ حضرات کی ہے، زمانہ کی ستم ظریفی ملاحظہ فرمایئے کہ آج مُسلم اور نیشنلسٹ اکٹھا لکھنا پڑتا ہے، حالانکہ کہاں ہمہ آفاقی مُسلم اور کہاں تنگ نائے نیشنلزم !) اِن حضرات نے گاندھی جی کو اپنی کشتی کا ناخدا اور اپنی "نمازوں" کا امام بنایا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد گاندھی جی بے نقاب ہونے شروع ہو گئے۔ اور اِن لوگوں نے بچشم خود دیکھ لیا کہ :-

خضر جس کو یہ سمجھتے تھے بلا کو نکلا !

چنانچہ بڑے بڑے قومیّت پرست اخبارات یہاں تک لکھنے لگے ہیں کہ :-

"ممکن ہے ہندو قوم جو اپنے ہاتھوں بنائے ہوئے بُت کو مسجود و معبود بنا لینے کی عادی ہے ۔ گاندھی جی کی الوہیّت و بزرگی کے آگے گردنیں خم کر دے، مگر مُسلمان جو فطرتاً جمہوریت پسند ہے کسی شخص واحد کی پرستش نہیں کر سکتا جو ہند و کلچر۔ ہندو معاشرت ۔ ہندی زبان اور ہندی روایات کا پیکر لئے اپنے دِلمیں بیٹھا رہے اور اسکی ترویج و ترقی کے اسباب پر غور کرتا رہتا ہے۔" (مدینہ - $\frac{۷}{۳۹}$ ۲)

واقعات نے یہ کچھ کہنے پر تو مجبور کر دیا۔ لیکن افسوس کہ اِن حضرات میں اتنی جرأت نہ پیدا ہوئی کہ قرآن کریم کی اِس حقیقتِ ثابتہ کا اعلان کر دیتے کہ فی الواقع کفّار کسی صُورت میں بھی مسلمانوں کے بہی خواہ نہیں ہو سکتے ۔ گاندھی جی کا بُت ٹوٹا تو انہوں نے کسی اور سومنات کی تلاش شروع کر دی ۔ اور بالآخر دُنیا کو بتا دیا کہ ؎

نماند نازِ شیریں بے خریدار!
اگر خسرو نباشد کوہ کن است

چنانچہ اب اِن حضرات نے گاندھی جی سے مُنہ موڑ کر مسٹر بوس کی "پرستش" شروع کر دی ہے، اور اُسے اپنی امیدوں کا قبلۂ مقصود بنا لیا ہے۔ حالانکہ اگر اِن حضرات کی نگاہ قرآن کریم کی حقیقتِ بالغہ پر ہوتی تو اِس بات کے سمجھنے میں کوئی دُشواری پیش نہ آتی کہ گاندھی اور بوس کا باہمی ہزار اختلاف ہو۔ دایاں اور بایاں بازو میں کتنی ہی وسیع و عریض خلیج کیوں نہ حائل ہو۔ اسلام سے عداوت اور مسلمانوں سے دشمنی میں یہ سب ایک ہیں۔ جو ایسا نہیں سمجھتا اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے۔ الکفر ملۃ واحدۃ۔

مسٹر بوس کو چونکہ اپنے متبعین کی ایک جماعت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اِسلئے وہ اپنے آپ کو اقلیتوں کے حامی ظاہر کرتے ہیں اور نہایت فخر سے لکھتے ہیں:۔

"ہمارے مسلک پر تنقید کرنے والے لوگ غالباً اس چیز سے حسد کرتے ہیں کہ جب اُنکے دایاں بازو کے احباب اقلیتوں کو اپنی طرف کھینچنے میں ناکام رہے ہیں، فارورڈ بلاک" شروع سے اِس مسئلہ میں بہت کامیاب ہو گیا ہے اور اسے بڑی حد تک اقلیتوں کی ہمدردیاں حاصل ہو چکی ہیں"۔ (فارورڈ بلاک ۔ صفحہ ۱۹)

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسٹر بوس کا مسلک اور منتہیٰ کیا ہے! وہ خود تحریر کرتے ہیں کہ مینے جو لائحۂ عمل اختیار کیا ہے' اس سے میری غرض یہ ہے کہ:۔

"ملک میں مارکس کے نظریہ کی حامل ایک جماعت پیدا کرنے کے لیئے زمین تیار کیجائے"۔

چنانچہ وہ اپنے اِسی مضمون کے اخیر میں لکھتے ہیں کہ ہماری تمام جدوجہد کا ماحصل یہ ہوگا کہ ملک میں ایک نئی زندگی اور نئی جدوجہد کا دَور پیدا کر دیا جائے اور

"یہ نیا دَور بلا شک شبہ سوشلزم کا دَور ہوگا"۔ (فارورڈ بلاک صفحہ ۱۲)

قدامت پرست گاندھی کو آپ دیکھ چکے۔ اور جدّت پرست بوس آپ کے سامنے ہے۔
اب اسکے بعد ہم اپنے قومیت پرست مسلم حضرات سے صرف اتنا دریافت کرتے ہیں۔

چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیرِ ما!

ایک عرصہ کے انتظار کے بعد جنابِ پرویز کے مشہور رسالہ "اسلامی معاشرت" کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوگیا۔ جن حضرات کو اسکے لیئے زحمت کشِ انتظار رہنا پڑا۔ ہم ان سے بدل معذرت خواہ ہیں۔ جو فرمائشیں اِس دوران میں جمع ہوچکی تھیں۔ اُن کی تعمیل کردی گئی ہے اگر کسی صاحب کو اپنے ارشاد کی تعمیل میں رسالہ نہ ملا ہو۔ براہِ کرم مطلع فرما دیں یہ رسالہ یوں تو ہر پڑھے لکھے مسلمان کے لیئے مفید ہے لیکن اسکا پورا پورا فائدہ اِس صورت میں اُٹھایا جاسکتا ہے جب یہ ہمارے اسلامیہ مدارس میں دینیات کے نصاب کے طریق پر رائج کردیا جائے۔ تاکہ ہمارے بچوں کے دِل و دماغ کی عمارت اِنہی بُنیادوں پر قائم ہو۔ اِسلامیہ ہائی اسکول۔ شملہ۔ کے اربابِ حل وعقد مستحق تبریک ہیں کہ اُنہوں نے اِس باب میں سبقت فرمائی ہے۔ اور "اسلامی معاشرت" کو اپنے دینیاتی نصاب میں داخل کرلیا ہے ہم دوسرے اِسلامی مدارس کے کارکنان کی خدمت میں درخواست کرینگے کہ وہ اس طرف توجہ فرمائیں۔ واضح رہے کہ یہ تحریک کسی "کاروباری" جذبہ پر مبنی نہیں ہے۔ اسلیئے کہ اس پمفلٹ کے منافع میں نہ تو جنابِ مصنف کا کوئی حصّہ ہے اور نہ کسی اور شخص کا۔ بلکہ اسکا مالک طلوعِ اسلام کا تبلیغی شعبہ ہے۔

یوں تو کتابت کی ہر غلطی جانکاہ ہوتی ہے لیکن سابقہ اشاعت میں حضرت علّامہ علیہ الرحمۃ کی دو رُباعیوں میں ایسی غلطیاں رہ گئی ہیں جنکے لیئے ہم بہت نادم ہیں براہِ کرم صفحہ پر مندرج رباعیوں کی یوں تصحیح فرمالیں۔

(۱) فرنگ آئینِ رزّاقی بداند ٭
باین بخشد ازو وا می ستاند ٭
بہ شیطاں آں چناں روزی رساند
کہ یزداں اندر آں حیراں بماند

---

(۲) اگر ایں آب وجاہے از فرنگ است
جبینِ خود منہ جُز بر درِ او ٭
سریں را ہم بہ پوشش دہ کہ آخر
حقے دارد بخر پالاں گرِ او

کاپیاں پریس کو جاچکی تھیں کہ ہمیں بعض اخبارات سے معلوم ہوا کہ مولانا حسرت موہانی صاحب نے اس امر کی پُر زور تردید فرمادی ہے کہ وہ لیگ میں "بایاں بازو" پیدا کرنے کا خیال کر رہے ہیں ہمیں اس تردید سے بے حد مسرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق اور استقامت عطا فرمائے کہ ہمارا ہر قدم انتشار سے اتحاد کی طرف بڑھے۔

پاکستان

پاکستان ملی تحریک پر اظہار رائے کرتے ہوئے مسلمان عموماً اور ہندو خصوصاً جلد بازی اور نافہمی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ ہندوؤں کو اس تحریک سے عناد اس وجہ سے ہے کہ یہ "مردِ مومن" کے فکر کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ وہ پاکستان تحریک کے اغراض و مقاصد پر غور و فکر کیے بغیر محض قومی تعصب اور سیاسی تنگ نظری کی بنا پر مخالفت کرتے ہیں۔ لیکن بعض مسلمان بھی جن میں اکثریت متحدہ قومیت پر جان دینے والے علما اور سیاسی لیڈروں کی ہے۔ پاکستان کے تصور کو خطرناک اور دل آزار تصور کرتے ہیں اور اس بات سے خائف ہوتے ہیں کہ کہیں ان کے غیر مسلم پیشوا برہم ہو کر ان کی سرپرستی سے دست کش نہ ہو جائیں۔ مسلمانوں میں ایک طبقہ اور بھی ہے جس کا خیال ہے کہ "پاکستان ایک محدود اور نامکمل تجویز ہے۔ جو مسلمانوں کی ہمہ گیر برادری کے منافی ہے۔ اور جغرافیائی لحاظ سے اس کی تقسیم ناممکن العمل ہے"۔ یہ رائے ممکن ہے خلوص پر مبنی ہو۔ مگر دُور اندیشی اور سیاسی بصیرت سے یکسر مبرا ہے۔

یہ بات محتاجِ بیان نہیں کہ ہندو ہر اس چیز سے بے زار اور سوگوار ہو گا جس میں مسلمان جماعت کی سلامتی اور منافع ہے اور خواہ اُسے مسلمان کی تنظیم اور درستگی سے کوئی نقصان نہ پہونچے مگر وہ حسد سے اس قدر مجبور ہے کہ جب تک وہ مسلمان کو برباد اور رسوا نہ دیکھ لے اس کی فطرت کو تسکین نہیں ہوتی۔ چنانچہ "پاکستان" کے نام پر اگر وہ غیض و غضب میں آتا ہے تو یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ مسلمان نے عدل و انصاف کا خون بہا دیا ہے یا ہندو کی حق تلفی کی ہے یا عالم گیر غارت گری سے دامن آلودہ کیا ہے۔ چنانچہ وہ لوگ جو پاکستان کے ذکر کو ہندوؤں کے لیے "پیغام جنگ" تصور کرتے ہیں غلطی میں مبتلا ہیں۔ ہندو کے نزدیک تو ہمارا ہر قول و فعل "پیغام جنگ" ہے وہ اس وقت تک کبھی میٹھی نیند نہیں سو سکتا جب تک کہ ہم بالکل نیست و نابود نہ ہو جائیں۔ مگر ہمارے عزائم ہرگز غاصبانہ نہیں ہیں۔ ہم کو اس سے تعرض نہیں کہ ہندو جنت نشان ہندوستان میں کیا کرتا ہے۔ وہ اپنے گھر کی رونق اور امن کے تحفظ کے لیے ہر ممکن اور مفید تدبیر پر عمل پیرا ہو سکتا ہے۔ لیکن اُسے دل و نظر میں اتنی

وسعت اور رواداری پیدا کرنی چاہیئے کہ اگر ہم بھی ان طریقوں کو اختیار کریں جن کا نام لے کر وہ بہ ظاہر "آزادی" اور "خود مختاری" کی پری سے ہمکنار ہونا چاہتا ہے تو اسے چیں بہ جبیں نہ ہونا چاہیئے بلکہ ہم مشربی کے تقاضے سے ہمارے ارادوں کو "مرحبا" کہنا چاہیے اور کامیابی کی "اشیرباد" دینی چاہیئے۔ کس قدر رنج کا مقام ہے کہ وہ لوگ جو غلامی اور ناداری کی مذمت میں قرار دادوں کا ایک سلسلہ لامتناہی شروع کیے ہوئے ہوں جب ہمارے روبرو ہوں تو اسی زحمت کو رحمت کہیں اور اسی زہر کو تریاق۔

اگر ہم سے بدسلوکی اور ناانصافی نہ بھی ہوتی اور بایں ہمہ ہم پاکستان کی جداگانہ ہستی کا مطالبہ کرتے تو بھی ہندو کو ملال نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کیوں کہ بدقسمتی سے ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں اور دونوں امن و آسائش کے متلاشی ہیں۔ لیکن اب جبکہ اس نے ہم پر روز روشن کی طرح ثابت کر دیا ہے کہ وہ نہ صرف غاصب اور خائن ہی ہے بلکہ بدترین قسم کا دشمن اور ستم گر بھی ہے تو وہ کس منہ سے ہم سے توقع رکھتا ہے کہ ہم بے زبان جانور کی طرح اس کا جور و تعدی سہتے رہیں اور اپنی زیست و حیات کا سرمایہ اس کے ہاتھوں میں دے کر اس کے رحم و کرم کی راہ گداگروں کی طرح تکتے پھریں۔ یہ چیز طبیعت پر اور بھی ناگوار گزرتی ہے جب یہ خیال آتا ہے کہ یہ رویہ ان لوگوں نے اختیار کیا ہے جو ہزار ہا سال سے غلامی کی روزی کھا کھا کر عالی حوصلگی، بلند ہمتی، رواداری، بردباری، وسیع چشمی اور جہاں بانی کے محاسن سے قطعاً عاری اور مفلس ہو چکے ہیں۔ ایسے لوگوں سے انصاف اور دل داری کی توقع رکھنا جنت الحمقا میں بسنے کے مترادف ہے ؎

ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

لیکن اس سے بھی زیادہ شرمناک غلطی اور حماقت ان لوگوں کی ہے جو اُلٹا ہمیں ہدفِ ناوکِ بیداد بنا کر ہم ہی سے خدمت اور ایثار کی توقع رکھتے ہیں ہم کس طرح اس چیز پر راضی ہو سکتے ہیں جو ہندوؤں کے لیے دولت اور برکت کی نیک فال ہو اور ہمارے لیے سیاسی قتل نامہ کی دستاویز۔

ہم نے برسوں کی متواتر کوششوں کے باوجود دیکھ لیا ہے کہ ہندو اور مسلم متحد نہیں ہو سکتے۔ سب سے پہلے اکبر نے مذہبی، نسلی اور معاشرتی اتحاد کا علم بلند کیا اس واقعہ کو تین سو سال گزر چکے ہیں۔ لیکن جو حشر اس سعیِ لاحاصل کا ہوا وہ مزید تصریح کا محتاج نہیں ہے۔ ہر گام پر قرآن کا اعلان ہمیں متنبہ کرتا ہے کہ اسلام اور غیر اسلامی

نظریۂ حیات کا آپس میں بعد المشرقین ہے۔ نور اور تاریکی کا اتحاد نہیں ہو سکتا۔ یہ فطرت کا اصول ہے اور ہمارے مشاہدہ میں ہزار بار آچکا ہے۔ چنانچہ ان سب پرانے تلخ واقعات کو دریا برد کر کے ہم امن و سکون کی نئی راہ تجویز کرتے ہیں جس سے ہندو اور مسلم کو غیر فطرتی اتحاد سے توڑ کر علیحدہ علیحدہ حلقوں میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ روز روز کا فساد اور واویلا ہمیشہ کے لیے گہری نیند سو جائے۔ اور دونوں گروہ حسب استعداد اور حسب منشا اپنی اپنی راہ چلیں۔ تم دیکھتے نہیں کہ ایک باپ کی نسل مدت تک ایک گھر میں سما نہیں سکتی اور ضروریاتِ زندگی کی بنا پر انہیں مختلف گھرانوں اور ملکوں میں تقسیم ہونا پڑتا ہے۔ لیکن جہاں سوال "صحبت ناجنس" کا ہو وہاں وقت گزارنا زہرہ گداز ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے۔ پس ہمارے نزدیک ہندو مسلم منافرت اور جنگ و جدل کا ایک ہی سہل ترین اور آبرومندانہ حل ہے اور وہ "پاکستان ملی تحریک" کی صورت میں ملک کے سامنے آچکا ہے۔

پاکستان ملی تحریک پر مخالفین کئی قسم کے اعتراض کرتے ہیں۔ ہندوؤں کے اعتراض تو ہر لحاظ سے غیر منصفانہ ہیں اس لیے ان کے جواب میں وقت ضائع کرنے کی ہمیں فرصت نہیں ہے۔ مسلمانوں کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ "پاکستان کی جداگانہ اور خود مختارانہ ہستی ناممکنات سے ہے اور ایک ناممکن چیز کے حصول کے لیے قوت اور دولت صرف کرنا اور ہندو کو برافروختہ کرنا قرینِ عقل نہیں ہے"۔ ہم اُن سے التماس کرتے ہیں کہ وہ تاریخ کے اوراق کھول کر اپنے اباؤ اجداد کے زرین کارنامے پڑھیں تو ان کو معلوم ہوگا کہ موجودہ حالت سے کہیں زیادہ یاس انگیز اور خطرناک وقتوں میں اُنہوں نے جانوں پر کھیل کر اپنی آبرو کو داغ غلامی سے بچایا ہے اور وہ کامران اور کامگار رہے ہیں۔ طارق اور محمد بن قاسم ہماری ہی طرح انسان تھے جنہوں نے عین عالمِ شباب میں وطن اور وطن کی آسائشوں سے مُنہ موڑ کر چند ہزار لشکریوں کے ساتھ دور افتادہ اور وسیع ممالک پر تاخت کی اور اُنہیں زیرِ نگین کیا۔ انہی ممالک پاکستان اور ہندوستان پر ہمارے بزرگوں نے تقریباً ایک ہزار سال تک اسلام کا جھنڈا لہرایا ہے اور وہ ہندوؤں کی کثرت اور برافروختگی سے مبہوت نہیں ہوئے تھے۔ کیا آج ہمیں اس بات کی ضرورت لاحق ہوئی ہے کہ ہم اپنی زلیست و حیات کی بقا اور مذہب و ملت کی احیا کے لیے اول ہندو کی خوشنودی اور منظوری حاصل کریں اور اگر وہ ہماری درخواست مسترد کر دے تو ہم مارے خوف کے اپنی اہم تحریکوں سے دست بردار ہو جائیں اور ہندو سے معافی اور امان مانگ لیں اور اگر ہم میں اتنی زبوں ہمتی اور پست حوصلگی نہیں تو کیا

وجہ ہے کہ ہم خدا اور اُس کے رسولؐ کو راضی کرنے میں اجتناب کریں اور ہندو کو برافروختہ کرنے سے حذر کریں کہ دنیا میں رسوائی کا طوق نصیب ہو اور آخرت میں خدا کا عتاب۔

ہمارے نزدیک اس تحریک کو ناممکن العمل کہنا عزم و ہمت کی کوتاہی کی دلیل ہے۔ جو قوم زندہ دل رکھتی ہو وہ موت سے کھیلنا اپنی آبرو کا نشان سمجھتی ہے اور اس کے لئے کسی چیز کے حصول کا خیال بفضل ایزدی "ناممکن" نہیں ہے۔ اگر مسلمانوں کو اکابر سلف کے واقعات خرق العادت نظر آتے ہیں اور ان کی پیروی میں مئے توحید کو لے کر دشت و جبل میں پھرنا وبالِ جان معلوم ہوتا ہے تو کم از کم اُنہیں عصر حاضر ہی کے جواں مردوں کے کارناموں سے سبق لینا چاہیے جنہوں نے گو بحر و بر تاراج نہیں کیے اور مشرق و مغرب سے خراج وصول نہیں کیا لیکن جوشِ عمل اور قوتِ مدافعت سے اپنی جبیں کو غلامی کے داغ سے بچایا ہے۔

مسلمانوں میں ایک اور طبقہ ہے جو بزعم خویش پاکستان کی تحریک کو تنگ نظری پر محمول کرتا ہے ان کا خیال ہے کہ اسلام کو ایک خاص چار دیواری میں قید نہیں کرنا چاہیئے بلکہ اُسے کل ہندوستان پر حاوی و طاری ہونا چاہیئے۔ ہمارے خیال میں ہر مسلمان کی یہی آرزو ہونی چاہیئے کہ اسلام کل ہندوستان کیا بلکہ سارے جہان پر پھیل جانا چاہیئے جب عزائم اتنے بلند ہوں کہ سارے جہاں پر اسلام کے تسلط کی آرزو دلوں میں موج زن ہو تو پاکستان کی نظریہ کو ناممکن العمل کیسے کہا جا سکتا ہے۔

یہ نیل گوں فضا جسے کہتے ہیں آسماں ہمت ہو پرکشا تو حقیقت میں کچھ نہیں

لیکن اسباب و علل کی دنیا میں اتنے بڑے مقصد کو یک قلم مسخر کر لینا اس بات سے زیادہ مشکل ہے کہ پاکستان کو فی الحال اسلامی ریاست میں منتقل کیا جائے۔ سردست ہندوستان کے وسیع ملک میں ہماری قوتیں منتشر اور پراگندہ ہو رہی ہیں۔ اور ان کا آپس میں ربط اور ضبط تقریباً مفقود ہو چکا ہے سو اندریں حالات بہتر یہی ہے کہ پاکستان کی سرزمین کو مسلمانوں کی تنظیم اور استحکام کے لیے منتخب کیا جائے۔ کیوں کہ تھوڑے حصے کا انتظام زیادہ آسان ہے۔ ترکوں نے جب احیائے قوم کا سنگِ بنیاد رکھنا چاہا تو اُنہوں نے قدیم عثمانیہ سلطنت کے بہت سے علاقوں سے ہاتھ اُٹھا لیا اور ایشیائے کوچک کے محدود علاقے میں جہاں اکثریت خالص ترکی قوم کی تھی محصور ہو کر اپنے سیاسی اور معاشرتی امراض کی اصلاح کی اور آج وہی ترک ہیں جن کے ساتھ دنیا

کی عظیم الشان سلطنتیں رابطۂ دوستی پیدا کرنے کو باعثِ فخر سمجھتی ہیں چنانچہ ہندوستان میں جس اکثریت کا فائدہ اٹھا کر ہندو ہم کو اپنے تسلط میں رکھنا چاہتا ہے پاکستان میں اسی اکثریت کی بنا پر ہم ہندو کی مداخلت سے مامون رہنا چاہتے ہیں۔

تحریک پاکستان اپنی قسم کی پہلی تحریک ہے جس کا واحد مقصد ہندو مسلم مناقشات اور اصل بنائے فساد کا استیصال ہے۔ اس کے منظرِ عام پر آنے کے بعد اور تحریکات معرضِ ظہور میں آئی ہیں، جن کا وجود سراسر پاکستان تحریک کے تخیل کا مرہون منت ہے۔ چنانچہ ہندوستان کو تاریخی، نسلی، ثقافتی اور جغرافیائی حیثیت سے تقسیم کرنے کی متعدد تحریکیں ملک و ملت کے سامنے ہیں۔ ہم نواب ممدوٹ اور سر سکندر حیات کی تجویزوں پر اجمال کے ساتھ تبصرہ کرتے ہیں تاکہ قارئین کرام کو معلوم ہو کہ پاکستان تحریک تمام تحریکوں سے خوبی اور کمال میں گوئے سبقت لے گئی ہے اور بعض سیاست دانوں کا یہ اعتراض کہ پاکستان ایک "فلسفی اور شاعر" کی دماغ کی اختراع ہے اس لیے تخیلات کی بے روح سکیم ہے محض سطحی اور فروعیانہ ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب کی سکیم اور نواب آف ممدوٹ کی اسکیم اصولی اعتبار سے قریب قریب یکساں ہیں۔ نواب صاحب کی اسکیم ہندوستان کو مذہبی بنا پر پانچ آزاد جمہوری ریاستوں میں تقسیم کرتی ہے لیکن اس میں نقص یہ ہے کہ ان پانچ ریاستوں کی تشکیل کرتے وقت بعض نہایت اہم اقتصادی اور جغرافیائی امور کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ مثلاً شمال مغربی ریاست (پاکستان) میں سے کانگڑہ کی وادی خارج کر دی گئی ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ اس علاقہ میں ہندوؤں کی اکثریت ہے لیکن یہ علاقہ جغرافیائی لحاظ سے طاس سندھ کا جزو لاینفک ہے۔ نیز کانگڑہ کے پہاڑوں میں جست، سیسہ اور لوہا کافی مقدار میں پایا جاتا ہے حال ہی میں کانگڑہ سے چالیس میل کے فاصلہ پر تقریباً چودہ میل کے رقبہ میں بہترین قسم کے خام لوہے کی کان دریافت ہوئی ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ اگر ارزاں ہائیڈرو الیکٹرک کے ذریعہ سے یہاں کان کنی کا کام شروع کیا گیا تو پنجاب قطعی طور پر بیرونی لوہے کی درآمد سے بے نیاز ہو جائے گا بلکہ نہایت آسانی سے لوہے کی کافی مقدار بیرون پنجاب بھی مہیا کی جا سکے گی۔ ان بیش قیمت معدنیات کے علاوہ یہ علاقہ "منڈی ہائیڈرو الیکٹرک پاور" کا سرچشمہ بھی ہے جو پنجاب کے تقریباً تین چوتھائی حصہ کو روشنی اور گرمی بخشتا ہے۔ اندازہ کیا

جاتا ہے کہ منڈی ہائیڈرو الیکٹرک اسٹیشن آئندہ ایک دو سال میں ایک لاکھ بیس ہزار کلو واٹ (KILOWATTS) بجلی پیدا کرے گا۔ جو تمام پنجاب کی ہر قسم کی ضروریات کے مکتفی ہوگی۔ ہائیڈرو الیکٹرک اور دیگر معدنیات کے بیش بہا دفینہ کو ہم پاکستان سے الگ کر کے اپنی قسمت کی عنان اغیار کے ہاتھوں میں سونپ نہیں سکتے۔ البتہ ہندوستان کی باقی ریاستوں کی تقسیم کے متعلق نواب صاحب کی اسکیم سے ہمیں چنداں اختلاف نہیں ہے۔

سر سکندر حیات خاں کی اسکیم جغرافیائی لحاظ سے شاید صحیح ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ ثقافتی اقتصادی تمدنی اور تاریخی معیار پر پوری نہیں اترتی۔ سر سکندر کا دعویٰ ہے کہ ان کی اسکیم اقتصادی بنا پر مستحکم ہے۔ لیکن جب وہ کرنسی۔ (Currency) درآمد کے محصولات۔ ریلوے اور ڈاک و تار کے محکمہ جات مرکزی حکومت کے ہاتھ میں دیتے ہیں تو اقتصادی استحکام کہاں رہتا ہے۔ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ جب تقسیم دولت کے جملہ وسائل اور عمرانی اور اقتصادی ترقی کے تمام ذرائع صوبائی خود مختاری کے باہر ہونگے تو وہ صوبہ جات کس طرح اقتصادی طور پر آزاد اور خوش حال رہ سکتے ہیں۔ زرعی صوبہ جات کی مانگ Demand بڑھانے اور گاہک پیدا کرنے کے ضروری ذرائع حتیٰ کہ اجناس کے نرخوں کا تعین بھی بیرونی اثرات کے تابع ہوگا اور مرکزی حکومت کی اس حکمت عملی کا منت پذیر ہوگا جو وہ صنعتی صوبوں کے زیر اثر درآمد برآمد کے محصولات کرنسی (Currency.) اور شرح تبادلہ کے تعین کے سلسلے میں روا رکھے گی۔ پاکستان کی اسی فی صدی آبادی زراعت پیشہ ہے جو مرکز کے صنعتی مفاد پر قربان کر دی جائے گی اور اس ۸۰ فی صدی آبادی کی غربت اور فلاکت کی ذمہ دار ریلوے اور محکمہ آب پاشی پر پڑے گی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اقتصادی ترقی کے یہ جدید ذرائع ابدی طور پر خسارے اور نقصان سے دوچار رہیں گے۔ اور پاکستان ہمیشہ کے لیے صنعتی صوبوں کا نزار اور ناتواں غلام بنا رہے گا پچھلے آٹھ نو سال سے اجناس کی مسلسل ارزانی اور کسانوں کی تباہ حالی اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ زراعتی اور صنعتی مفاد غریب کسانوں اور سرمایہ داروں کا مفاد مسلمانوں اور ہندوؤں کا مفاد ایک نہیں ہو سکتا۔ سر سکندر کی اسکیم ان تمام حقائق سے جن پر زرعی صوبوں کی اقتصادی زندگی کا انحصار ہے۔ صریحاً چشم پوشی کرتی ہے۔ لہٰذا انکی اسکیم نہ صرف قابلِ قبول ہے بلکہ ناقابل عمل بھی ہے۔

پاکستان ملی تحریک اور دوسری سب تحریکوں میں اصولی اور بنیادی فرق جسے اکثر نظر انداز کردیا جاتا ہے یہ ہے کہ پاکستان تحریک خالصتاً اسلامی مفاد اور اسلامی تہذیب کے تحفظ کی سکیم ہے اور وہ ہندوستان سے کلیتہ ہر لحاظ اور ہر اعتبار سے علیحدگی کی مدعی ہے اور " ہندوستانی قومیت" کا عنصر بننے سے صریحاً انکار کرتی ہے اس کا مطالبہ قریب قریب ان اصولوں پر ہے جن پر کاربند ہو کر لنکا اور برما ہندوستان خاص سے علیحدہ ہو گئے ہیں تاریخی جغرافیائی، نسلی اور ثقافتی لحاظ سے پاکستان ہندوستان سے الگ ملک ثابت کیا جا چکا ہے۔ تو کیا وجہ ہے کہ اُسے علیحدہ حق زیست سے محروم کیا جائے۔ اور خواہ مخواہ اسے غلام آباد ہندوستان کی قسمت سے وابستہ کیا جائے۔ ہر تحریک جو مسلمانوں کی بہتری اور بہبودی کے لیے ہمارے سامنے ہو ہماری ہمدردی اس کے ساتھ ہے۔ لیکن کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ کارکنان "قضا و قدر" ہندوستان کے متعلق جو چاہیں فیصلہ کریں پاکستان کو اپنی ہنگامہ خیز تجویزوں اور معرکۃ الآرا بحثوں اور مجوزہ قطع و برید سے قطعاً مستثنیٰ رکھیں۔ کیوں کہ پاکستان اور ملک ہے اور ہندوستان اور۔

پاکستان تحریک سے ایک شکایت ان مسلمانوں کو بھی ہے جو ہندوستان خاص میں بستے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس تحریک سے فقط پاکستان کے مسلمانوں کا فائدہ مطلوب ہے۔ باقی مسلمان جو ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں ان کا اس نعمت میں کوئی حصہ نہیں ہے بلکہ ان کا پاکستان کے مسلمانوں سے جو واسطہ اب ہے وہ بھی ساقط ہو جائیگا ان کو قدرتاً یہ خدشہ ہے کہ وہ اپنی برادری کے ایک بڑے حصہ سے منقطع ہو جائیں گے۔ انکی خدمت میں التماس ہے کہ "پاکستان ملی تحریک" کا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کی جماعت میں تفریق ڈالے۔ یا ہندو مسلم میں نفرت اور حقارت کے جذبات پھیلائے۔ بلکہ اس کا مقصد وحید محض یہ ہے کہ مسلمانوں کو پھر نئے سرے سے اس طاقت عظمت۔ یکجہتی اور اخوت کی دعوت دیجائے جو صدیوں تک اس آسمان نیلی رواق کے نیچے ہمارا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ پاکستان کی علیحدگی ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ہرگز موجب نقصان نہیں ہے۔ اعداد اور شمار سے ثابت ہوتا ہے کہ پاکستان کے مسلمانوں کو شامل کر کے مسلمانوں کا ہندوستان کی کل آبادی میں ۲۳½ فی صدی حصہ ہے۔ پاکستان کی علیحدگی سے مسلمانوں کا تناسب ۱۷½ فی صدی رہ جاتا ہے

یعنی اگر پہلی صورت میں ہم اقلیت میں رہتے ہیں تو دوسری حالت میں بھی اقلیت میں رہتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ موجودہ نظام جمہوریت میں اقلیت خواہ کتنی ہی مضبوط اور بااثر کیوں نہ ہو۔ اکثریت کے سامنے بے دست و پا ہے اور اکثریت اقلیت کو "ڈرا دھمکا کر" فریب و دجل سے قابو میں رکھ سکتی ہے۔ اگر ہم پاکستان کا تحفظ نہ چاہیں اور بدستور ہندوستان خاص کا عنصر بنے رہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم سارے کے سارے آٹھ کروڑ مسلمان اغیار کے دست نگر ہو جاتے ہیں۔ اور نہ صرف یہی بلکہ ہمیشہ کے لیے قہاری اور جباری کے سومناتھ کی دہلیز پر سر رگڑتے رہیں گے۔ لیکن اگر پاکستان کے تین کروڑ مسلمانوں کا تحفظ ہو جائے تو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ہم نے آدھی مہم سر کر لی ہے۔ اگر دو بھائی ایک ساتھ قید میں ہوں اور دونوں رہائی حاصل کرنے کی جدوجہد کر رہے ہوں اور اُن دونوں میں ایک کے آزاد ہونے کے امکانات زیادہ ہوں تو دوسرے کو بھی اُسی ایک کی رہائی پر زور لگانا چاہیئے کیوں کہ وہ آزاد ہو کر بیرونی اور خارجی اثر و رسوخ سے دوسرے کو بھی نجات دلا سکتا ہے۔ لیکن اگر دونوں طوق و سلاسل میں اسیر رہیں اور اس بات پر قانع رہیں کہ دونوں میں جُدائی نہ ہو تو وہ آزادی کے جنت الماویٰ کی خوشبو کو قیامت تک نہیں سونگھ سکتے۔

عالمگیر آزادی کی جدوجہد میں جب کہ ہماری برادری کے افراد نے یکے بعد دیگرے ترکی، عرب، ایران اور افغانستان کو ادبار، ذلت اور نکبت کی زندگی سے نجات دلائی ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہم اُن کی پیروی میں پاکستان کو آزاد نہ کرائیں۔ پاکستان آزاد ہو گا تو ہندوستان کی خزاں بھی بہار سے بدل جائے گی۔ فطرت کا اصول یہی ہے کہ درجہ بدرجہ ترقی کی جائے اور قدم بہ قدم منزل کی جانب بڑھا جائے۔

ہمیں ہندوستان کے مسلمانوں سے کوئی پرخاش نہیں ہے ان کا نقصان ہمارا نقصان اور ان کا فائدہ ہمارا فائدہ ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ آزادی حاصل کرنے کے لیے کون سا طریق کار اختیار کیا جائے، جو نسبتاً آسان ہو۔ پاکستان کے باشندوں میں قدرتاً قوتِ عمل، جوش اور استقلال ہندوستانیوں کے مقابلے پر زیادہ ہے۔ اس لیے ہر لحاظ سے وہ غلامی کے حصار سے باہر نکل کر اپنی باقی جماعت کے لیے زیادہ مفید اور کارآمد ہو سکتے ہیں۔

ہمیں آل انڈیا ہندو یا آل انڈیا مسلم فیڈریشن سے کوئی بحث نہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ آل انڈیا جو بات

بھی ہوگی وہ ہندوؤں کے نظام کے متوازی ہوگی اور جو چیز اُنکے نظام کے متوازی ہوگی وہ آزادی سے صریحاً دور ہوگی اور زوال اور رجعت کے خمیر سے اس کی بنیاد پاک نہ ہوگی۔ لہٰذا اگر ہم ہندوستان کی چار دیواری کے اندر رہ کر ہندو کے دوش بہ دوش اپنی جُداگانہ ہستی کا مطالبہ خواہ مذہب وملّت کا نام لے کر بھی کریں گے تو ہم کسی صورت میں بھی آزادی اور خوش حالی کے قریب نہیں ہونگے۔ بلکہ ہمارا حشر وہی ہوگا جو ہندو کا ہوگا اور ہمیں وہی چیز میسر آئے گی جس کی طلب وتقاضا ہندو، دولت برطانیہ سے کرے گا۔ ایسی صورت میں جب کہ ہمارا نصب العین۔ ہمارا منتہائے خیال اور ہمارا مقصد حیات ہندو سے سراسر مختلف ہے ہمارے لیے انسب اور واجب یہی ہے کہ ہم ہندو کے قائم کردہ معیار سے انحراف کریں اور اپنی سیاسی معاشرتی اور ثقافتی زندگی کی بنیاد خالص اسلامی صُولوں پر پاکستان کے اندر رکھیں۔ بقول حضرت علامہ اقبال رح

"اسلام کی ثقافتی قوّت کی بقا اسی میں ہے کہ ملک کے ایک

حصہ میں اس کی مرکزیت قائم ہو جائے"

پاکستان میں آزاد اسلامی ریاست کے قیام کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اُسے ہندوؤں یا کسی غیر اسلامی جماعت کے خلاف ناجائز طور پر استعمال کیا جائے۔ اسلام عدل وانصاف کا مذہب ہے۔ اور تاریخ کے اوراق اس کے پیروؤں کی خطاپوشی، رواداری اور جود وعطا کی داستانوں سے بھرے پڑے ہیں۔ پاکستان میں ہر غیر مسلم فرقہ یا جماعت کے حقوق کی پاسبانی خالص اسلامی قائم کردہ آئین کی رو سے کی جائے گی جو دُنیا کی "متمدن" حکومتوں کے نظام کے برعکس صحیح عدل وانصاف پر مبنی ہیں۔ جب ہم غیر مسلموں کو فیاضی اور فراخدلی سے رعایت دینے پر تیار ہیں تو کیا وہ مسلمان جو ہمارے خیر اندیش بلکہ ہمارے جسم کا حصّہ ہوں گے مگر پاکستان کے باہر ہوں گے۔ ہماری ہمدردی اور شفقت سے محروم رہ سکتے ہیں!

حمید پاک۔ گوجرانوالا

نوٹ:۔ خریداران رسالہ کی خدمت میں التماس ہے کہ خط وکتابت کے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں۔ "منیجر"

قرآن پاک کی سورتوں کی ترتیب

رسول اللہ ﷺ نے فرمائی تھی یا حضرت عثمان رضؓ نے

قرآن پاک کی عظمت وجلالت پر میری تصنیف "پیام امین" پر ریویو کرتے ہوئے آپ نے ماہ جون کے مجلّہ "طلوع اسلام" میں میری اس رائے سے اختلاف کیا ہے کہ "حضرت عثمان رضؓ نے ..... سورتوں کو ترتیب دے کر فتنہ تحریف کو ہمیشہ کے لیے مٹا دیا"۔ اور اپنی یہ رائے ظاہر فرمائی ہے کہ "سورتوں کو حضرت عثمان رضؓ نے ترتیب نہیں دیا۔ بلکہ ترتیب آیات وسور بحکم خداوندی خود نبی اکرم ﷺ نے فرمائی تھی"۔

آپ کا یہ خیال درست نہیں ہے قرآن مجید کی موجودہ ترتیب تقریباً ساڑھے تیرہ سو سال سے علی حالہ قائم ہے اور یہ مختلف تدریجی منازل طے کرنے کے بعد عمل میں آئی تھی جس کا تذکرہ ناظرین "طلوع اسلام" کے لیے خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

پہلی منزل

قرآن پاک کی ترتیب کی پہلی منزل یہ تھی۔ کہ جب کوئی آیت سرور کائنات (صلعم) پر نازل ہوتی تو وہ اس کا مقام ترتیب[1] مقرر کر دیتے۔ یعنے کسی سورہ میں جس جگہ بلحاظ مفہوم اس آیت کا درج کرنا مناسب ہوتا اس کی تعیین فرما کر کاتب وحی سے اس کو لکھوا دیتے۔ بعض احادیث میں یہ بھی آیا ہے کہ آیات کی ترتیب میں وحی الٰہی کو بھی دخل تھا۔ بہرحال یہ مسلّم ہے کہ سورتوں میں آیات جس ترتیب سے درج ہیں۔ وہ رسول اللہ (صلعم) کے ارشاد وھدایت کے مطابق واقع ہوئی ہے۔ صحابہ نے اس میں کسی قسم کا ردّ وبدل روا نہیں رکھا یہی ترتیب اب تک قائم ہے۔ اور اس میں کسی قسم کا ابہام یا اختلاف نہیں ہے۔

[1] ترمذی۔ ابواب تفسیر القرآن۔ اتقان نوع ۱۸۔

دوسری منزل

ابتدا اسلام میں کتابت کا رواج نہ تھا۔ اس لیے کتابت کا کام حافظہ سے لیا جاتا تھا۔ قرآن کریم کی حفاظت واشاعت بھی اُس زمانے میں حافظہ ہی کی رہین منت تھی اور تحریر وکتابت کے عدم رواج کی تلافی حفظ قرآن سے کی جاتی تھی۔ لیکن وفات نبویؐ کے بعد مسیلمہ کذاب کی برپا کی ہوئی جنگ یمامہ میں جب حفاظ قرآن بہ تعداد کثیر شہید ہوئے اور کلام الٰہی کے بہت بڑے حصے کے مٹ جانے کا خدشہ پیدا ہوگیا تو حضرت عمرؓ کی تحریک سے حضرت ابوبکرؓ نے جو اس وقت مسند خلافت پر متمکن تھے۔ جمع قرآن کا کام شروع کیا اور یہ خدمت حضرت عمرؓ اور حضرت زیدؓ بن ثابت (کاتب وحی) کے سپرد کی۔

اس سے پہلے قرآن کی سورتیں ہڈیوں۔ پتھروں، اور کاغذ کے ٹکڑوں۔ کھجور کی چھال وغیرہ پر مرقوم اور اوراق پریشاں کی مانند بکھری پڑی تھیں۔ حضرت ابوبکر کے حکم سے ان سب کو فراہم اور نقل کیا گیا۔ جب تک حضرت ابوبکرؓ سریر آرائے خلافت رہے۔ یہ بے ترتیب مجموعہ ان کی تحویل میں رہا۔ اور ان کے بعد حضرت عمرؓ اور حضرت عمر کے بعد حضرت حفصہ کے قبضے میں آیا۔ [1]

تیسری منزل

قرآن پاک کے یہ غیر مرتب اجزا حضرت عثمانؓ کی خلافت کے دوسرے سال یعنی ۲۵ھ تک حضرت حفصہ کے پاس رہے۔ اختلافِ قرارت تو پہلے سے موجود تھا۔ لیکن جب حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں اس اختلاف نے بڑھتے بڑھتے اختلافِ معنی کی صورت اختیار کرلی۔ اور فتنۂ تحریف کا آغاز ہوا تو حضرت عثمان نے اس کے مہلک نتائج کو بھانپ کر ایک قرارت اور ایک مصحف پر جمع کرنے کا تہیہ کرلیا اور قریش اور صحابہ کو قرآنِ پاک کی کتابت پر مامور کیا۔

کتابت قرآن میں رسول اللہ (صلعم) کی قرأت ملحوظ رکھی گئی۔ اور جہاں کچھ شبہ ہوا۔ وہاں آیت لغتِ قریش کے مطابق درج کی گئی۔ حضرت عثمان نے ان اجزا کو محض یک جگہ نقل کروانے پر اکتفا نہیں کی۔ بلکہ

---

[1] بخاری باب جمع القرآن۔

دوسری منزل

ابتدا اسلام میں کتابت کا رواج نہ تھا۔ اس لیے کتابت کا کام حافظہ سے لیا جاتا تھا۔ قرآن کریم کی حفاظت واشاعت بھی اُس زمانے میں حافظہ ہی کی رہین منت تھی اور تحریر وکتابت کے عدم رواج کی تلافی حفظ قرآن سے کی جاتی تھی۔ لیکن وفات نبویؐ کے بعد مسیلمہ کذاب کی برپا کی ہوئی جنگ یمامہ میں جب حفاظ قرآن بہ تعداد کثیر شہید ہوئے اور کلام الٰہی کے بہت بڑے حصے کے مٹ جانے کا خدشہ پیدا ہوگیا تو حضرت عمرؓ کی تحریک سے حضرت ابوبکرؓ نے جو اس وقت مسند خلافت پر متمکن تھے۔ جمع قرآن کا کام شروع کیا اور یہ خدمت حضرت عمرؓ اور حضرت زیدؓ بن ثابت (کاتب وحی) کے سپرد کی۔

اس سے پہلے قرآن کی سورتیں ہڈیوں۔ پتھروں، اور کاغذ کے ٹکڑوں۔ کھجور کی چھال وغیرہ پر مرقوم اور اوراق پریشاں کی مانند بکھری پڑی تھیں۔ حضرت ابوبکر کے حکم سے ان سب کو فراہم اور نقل کیا گیا۔ جب تک حضرت ابوبکرؓ سریر آرائے خلافت رہے۔ یہ بے ترتیب مجموعہ ان کی تحویل میں رہا۔ اور ان کے بعد حضرت عمرؓ اور حضرت عمر کے بعد حضرت حفصہ کے قبضے میں آیا۔ [1]

تیسری منزل

قرآن پاک کے یہ غیر مرتب اجزا حضرت عثمانؓ کی خلافت کے دوسرے سال یعنی ۲۵ھ تک حضرت حفصہ کے پاس رہے۔ اختلافِ قرارت تو پہلے سے موجود تھا۔ لیکن جب حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں اس اختلاف نے بڑھتے بڑھتے اختلافِ معنی کی صورت اختیار کرلی۔ اور فتنۂ تحریف کا آغاز ہوا تو حضرت عثمان نے اس کے مہلک نتائج کو بھانپ کر ایک قرارت اور ایک مصحف پر جمع کرنے کا تہیہ کرلیا اور قریش اور صحابہ کو قرآنِ پاک کی کتابت پر مامور کیا۔

کتابت قرآن میں رسول اللہ (صلعم) کی قرأت ملحوظ رکھی گئی۔ اور جہاں کچھ شبہ ہوا۔ وہاں آیت لغت قریش کے مطابق درج کی گئی۔ حضرت عثمان نے ان اجزا کو محض یک جگہ نقل کروانے پر اکتفا نہیں کی۔ بلکہ

---

[1] بخاری باب جمع القرآن۔

استدراک

ہم نے جون کے رسالہ میں بھی لکھا تھا اور اب بھی لکھتے ہیں کہ مصنف پیامِ امین کا یہ خیال تاریخ اسلام کی رُو سے قطعاً بے بنیاد ہے کہ سورتوں کی ترتیب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دی۔ انہوں نے جس روایت سے یہ سمجھا ہے اس کا تعلق صرف سورۂ انفال اور سورۂ برائت کے اتصال سے ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ عہدِ عثمانی تک قرآن کی سورتیں غیر مرتّب اور منتشر تھیں اور لوگ بلا کسی ترتیب کے قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے اور حفاظ نے بھی اسے یونہی بلا کسی ترتیبِ سور حفظ کر رکھا تھا۔

امام جلال الدین سیوطی اپنی مفید کتاب اتقان میں لکھتے ہیں کہ قرآن کی سورتوں کی ترتیب کے متعلق علمائے محققین کا قول یہی ہے کہ وہ توقیفی ہیں یعنے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مرتب فرمایا تھا۔

قاضی ابوبکر کہتے ہیں کہ سورتوں کی ترتیب توقیفی ہے جس طرح آیات کی ترتیب آن حضرت کو جبریلؑ نے بتائی تھی اسی طرح سورتوں کی بھی جس قدر قرآن اتر چکا تھا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم رمضان شریف میں اس کو دہراتے تھے اور جبریل اس کو مرتب کرا دیتے تھے۔

کرمانی اور طیبی کا بھی یہی قول ہے کہ قرآن اگرچہ حسب اقتضائے ضرورت ٹکڑے ٹکڑے نازل ہوا لیکن اس کی اصلی ترتیب جو لوحِ محفوظ میں تھی اس کے مطابق آیتیں بھی اور سورتیں بھی آنحضرت ہی نے مرتب فرما دیں

بیقہی لکھتے ہیں کہ قرآن کی تمام آیتیں اور سورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی میں مرتب ہو گئی تھیں۔ صرف انفال اور برارت میں ترتیب نہ تھی (کیونکہ ان سورتوں کے نزول کا سلسلہ جاری تھا[1]) اور اس کی دلیل میں وہی حضرت ابن عباس والی روایت لکھی ہے جس سے پیام امین کے مصنف نے یہ سمجھا ہے کہ قرآنی سورتوں کی ترتیب حضرت عثمانؓ نے دی

حضرت عثمان کا کام صرف یہ تھا کہ انہوں نے قراۃ کے اختلافات کو مٹا کر تمام اُمت کو ایک قرأت پر مجتمع

---

[1] سورۂ برائت سب سے آخر میں نازل ہوئی۔ اور آنحضرتؐ نے اس کے متعلق ارشاد نہ فرمایا کہ یہ جُداگانہ سورت ہے۔ اس وجہ سے حضرت عثمان نے صحابۂ کرام کے مشورے سے سورۂ انفال سے اس کو الگ تو کر دیا مگر بیچ میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہیں لکھوایا۔ کیوں کہ دونوں سورتوں کا مضمون ہم آہنگ ہے۔ بس یہ ہے ساری کائنات جس پر پیام امین کے مصنف حضرت عثمان کو سورتوں کا مرتّب قرار دیتے ہیں۔

کر دیا۔ اور بس۔ جو مصحف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابو بکر کے عہد میں لکھا گیا تھا اسی کو بعینہٖ اُنہوں نے نقل کرا کے پانچ نسخے ولایات میں بھیجے اور ایک نسخہ اپنے پاس رکھا جس کا نام امام تھا۔

علامہ محاسبی لکھتے ہیں کہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ عثمان رضؓ جامع قرآن ہیں۔ حالانکہ یہ غلط ہے اُنہوں نے تو صرف یہ کیا کہ اُمت کو ایک قرأت پر مجتمع کر دیا جو مہاجرین و انصار کی ایک معتبر جماعت کے اتفاق کے ساتھ بصحتِ روایت و درایت طے کر کے لکھی گئی کیوں کہ اس وقت اہلِ شام و عراق نے قرأت میں اختلافات پیدا کر دئے تھے۔

علامہ ابن التین لکھتے ہیں کہ ابو بکر و عثمان رضؓ کے جمع قرآن میں یہ فرق تھا کہ ابو بکرؓ نے تو اس خوف سے جمع کیا تھا کہ کہیں وہ ضائع نہ ہو جائے کیوں کہ اس وقت وہ منتشر اور متفرق صحیفوں میں لوگوں کے پاس تھا۔ اُنہوں نے ان سب کو لے کر اسی ترتیبِ آیات و سور کے ساتھ جو آنحضرتؐ سے سنی تھی ایک شیرازہ میں کر دیا۔ اور حضرت عثمان نے جب لوگوں کو وجوہِ قرأت میں اختلاف کرتے دیکھا تو اسی مصحف کو اصلی قریش کے لہجہ میں اس صحیح قرأت کے موافق جو عرضۂ اخیرہ کے مطابق تھی اور جس کی صحت میں مطلق شبہ نہ تھا نقل کرا دیا۔ تاکہ اختلافات رفع ہو جائیں۔ اُنہوں نے اس کی ترتیب میں نہ تقدیم کی نہ تاخیر اور نہ کسی تاویل کو دخل دیا۔

(ماخوذ از تاریخ القرآن مؤلفہ علامہ اسلم جے راج پوری)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی سورتوں کی ترتیب بھی خود نبیٔ اکرم نے فرمائی تھی نہ کہ حضرت عثمان نے۔ طلوع اسلام

لامرکزیت

(اسد ملتانی)

سوال

کون ہوگا جسے توحید کا اقرار نہیں ! — کون ہم میں سے محمدؐ کا فدا کار نہیں
کون رکھتا نہیں قرآں کی صداقت پہ یقیں — کون اسلام کی شوکت کا طلبگار نہیں
پھر سبب کیا ہے کہ ایں ہمہ ایمان و عمل ! — ہم جہاں میں کسی عزت کے سزاوار نہیں
جسنے اسلاف کو دنیا میں سرافراز کیا — کیوں میسّر ہمیں وہ دولتِ بیدار نہیں

جواب

نیک کا مومنیں ہیں مصروف بہت لوگ مگر — ایک کو دوسرے سے کوئی سروکار نہیں !
صاحبِ سیف بھی ہیں اہلِ قلم بھی ہیں بہت — لیکن افسوس کہ آپس میں مددگار نہیں
باغِ ملّت میں ہیں موجود ہر رنگ کے پھول — لیکن آراستہ پیراستہ گلزار نہیں !
یوں تو چلنے کو چلے جاتے ہیں چلنے والے — اک طرف سب کی نگاہیں دمِ رفتار نہیں
سرفروشوں کی کمی اب بھی نہیں ملّت میں — اُن سے جو کام لے ایسا کوئی سردار نہیں
قوم ترشی ہوئی اینٹوں کا اک انبار تو ہے — لیکن اک سیسہ پلائی ہوئی دیوار نہیں !

زیب و زینت کے بھی اسباب مہیا ہیں بہت — اُس عمارت کیلئے جو ابھی تیار نہیں !
پُوری تسبیح کے دانے ہیں فراہم لیکن — جسمیں اُن سب کو پرو دیں وہی اک تار نہیں !
بیشمار انجمنیں ہیں مگر اُن کا حاصل — کچھ بجز تفرقہ و فتنۂ پیکار نہیں !
اہلسنت ہیں مگر اہل جماعت ہیں کہاں — کان سُنتے ہیں مگر آنکھ گنہگار نہیں !
ہم نے جس چیز کو تنظیم سمجھ رکھا ہے ! — وہ بجز کوششِ نقالیِ اغیار نہیں !

ہے اسد ہم میں کمی کوئی تو بس اتنی ہے ،
اک جماعت نہیں ، مرکز نہیں سردار نہیں

ادارہ طلوع اسلام

کے

شائع کردہ پمفلٹوں کا سٹ طلب فرمائیے

اور

ملاحظہ کیجئے کہ ان میں سیاستِ حاضرہ کے اہم مسائل کا حل
کتاب و سنت کی روشنی میں

کس

حُسن و خُوبی سے پیش کیا گیا ہے

ادارہ کی جملہ مطبوعات کا تمام منافع طلوع اسلام کے شعبۂ تبلیغ کیطرف منتقل کردیا جاتا ہے

”پیغمبر محکوم“؟

جناب محمد شریف صاحب چشتی ایم اے (علیگ)

معراجِ ”مسلمانی“ افرنگ کی محکومی!

نخچیری و دلگیری ، مجبوری و مظلومی

”الہام“ یہ کہتا ہے کافر ہے مسلماں بھی گر اُس نے کلیسا کی دہلیز نہیں چومی!

”تا حشر رہے قائم فرعونی و نمرودی

یورپ کے خداؤں کی مشہ راہی قیومی“

صورتگرِ محشر بھی، غارتگرِ ملت بھی!! محکوم ”پیمبر“ کے افکار کی ”معصومی“

اس شوخ ”نبوت“ کے ”الہام کا کیا کہنا!

اے وائے مسلماں کی شمشیر سے محرومی!

نادر شاہ اور اتحادِ سُنّی و شیعہ

از علاّمہ حافظ محمد اسلم صاحب جے راج پوری

ہرچند کہ نادر شاہ اپنی سفاکیوں کی بدولت چنگیز خاں، ہلاکو اور تیمور وغیرہ کی فہرست میں مندرج ہے۔ لیکن باوجود ان خونریزیوں کے اس کے دل میں مسلمانوں کا درد تھا اور چاہتا تھا کہ اسلامی فرقے باہم متحد ہو جائیں۔

ایران میں شاہان صفویہ نے اپنے اغراض کے لیے خلفائے ثلثہ اور صحابۂ کرام کا سب و شتم رائج کر دیا تھا۔ نادر کو یہ دیکھ کر سخت رنج ہوتا تھا کہ اس قبیح فعل کی وجہ سے ایرانی تمام عالم اسلامی کی دشمنی مول لے رہے ہیں۔ اور ان میں اور دیگر ممالک کے مسلمانوں مثلاً ہندوستانیوں۔ افغانیوں اور عثمانیوں میں عداوت کی خلیج زیادہ وسیع ہوتی جا رہی ہے جس کی وجہ سے ہر وقت مصادمت کا خطرہ ہے۔

چنانچہ دشمنوں کو مغلوب اور ممالک کو مفتوح کرنے کے بعد ۱۱۴۷ھ میں صحرائے مغان میں جہاں امرائے ایران کا عظیم الشان اجتماع اس لیے ہوا تھا کہ اس کے سر پر ایران کی شہنشاہیت کا تاج رکھا جائے اس نے کہا کہ:۔

"شاہ طہماسپ و شاہ عباس در عہد سریر موجود اند۔ ایشاں را یا ہر کس را کہ بر ازندۂ افسر سروری دانند بریاست و سلطنت بردارند۔ ما آنچہ حق کوشش بود دریں چند سال بجا آوردیم و دلایات ایشانرا با اُسرائے ایشان از دست افغان و روس و رومی خلاص کردیم۔ (تاریخ جہاں کشائی نادری صفحہ ۱۹۶)"

سب لوگوں نے بالاتفاق کہا کہ اب ایران کا ایک بچہ بھی سوائے تمہارے کسی کی بادشاہی پر رضامند نہیں ہے لیکن وہ برابر انکار کرتا رہا اس انکار و اصرار میں تقریباً ایک مہینے کا عرصہ گزر گیا اور جب لوگوں نے اس کا دامن نہ چھوڑنا چاہا تو اس نے کہا۔

"از زمان رحلتِ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم چہار خلیفہ بعد از یکدگر متکفل امر خلافت شدہ اند کہ ہند و روم و ترکستان ہمگی بخلافت ایشاں قائل اندر در ایران ہم سابقاً ہمیں مذہب رائج و متداول بود۔ شاہ اسمٰعیل صفوی در مبادی حال بنا بر صلاح دولت خود ایں مذہب را متروک و مذہب تشیع را مسلوک داشتہ بعلاوہ آں سب و رفض را کہ فعل بیہودہ و مایۂ مفاسد است در السنہ و افواہ عوام داد باش دائر و جاری کردہ شرر شرارت بچقماق زد و بر ہم زنی انگیخت و خاک ایراں را بخون فتنہ و فساد آمیخت و مادام کہ ایں فعل مذموم انتشار داشتہ باشد ایں مفسدہ از میان اہل اسلام رفع نخواہد شد۔ ہرگاہ اہالی ایران بسلطنت ما راغب و آسائش خود را طالب باشند باید کہ ایں ملت را کہ مخالف مذہب اسلاف کرام ماست تارک و بمذہب اہل سنت و جماعت سالک شوند۔ لیکن چوں حضرت امام جعفر صادق ذرّیہ رسول اکرم و ممدوح امم ہستند و طریقۂ اہل ایران بمذہب آنحضرت آشنا ست ادراسر مذہب خود ساختہ در فروعات مقلد طریقہ و اجتہاد آنحضرت باشند"۔ (تاریخ جہاں کشائے نادری صفحہ ۱۹۷)

اہل ایران نے اس کی بات قبول کرلی۔ اور محضر لکھ کر سب نے اس پر مہر لگائی۔ اس وقت نادر نے ایران کا تخت قبول کیا اور کہا کہ چونکہ بادشاہ روم خلیفۂ اسلام ہے اس لیے میں یہ تمام سرگذشت لکھ کر اس کے دربار میں بھیجتا ہوں تاکہ باہم مصالحت اور دوستی قایم ہو جائے اور اختلافات مٹ جائیں نیز میں اس سے پانچ باتوں کی درخواست کروں گا۔

(۱) چونکہ اہل ایران اپنے سابقہ عقائد سے جو موجب عداوت تھے تائب ہوگئے اس لیے خلیفہ و علماء و قضاۃ عثمانی سے درخواست ہے کہ مذہب جعفری کو ایک پانچواں مذہب شمار کر کے اسکی صحت تسلیم کرلیں

(۲) کعبہ میں جہاں چار مصلّے قائم ہیں وہاں ایک مصلّے جعفری مذہب کا بھی قائم کر دیا جائے تاکہ ایران کے لوگ اس مصلے پر اپنے امام کے پیچھے نماز ادا کرسکیں۔

(۳) ایرانی قافلہ حجاج کسی ایرانی ہی میر حاج کی قیادت میں ہر سال مکہ جایا کرے اور عثمانی امراء اس کے ساتھ بھی وہی مراعات برتیں جو دوسرے ممالک مثلاً مصر یا شام کے قافلہ حجاج کے ساتھ مرعی رکھتی ہیں

(۴) دونوں دولتوں ایران و روم میں سے ہر ایک دولت کے پاس دوسرے کے جو اسیران جنگ ہوں وہ آزاد رکھے جائیں غلام نہ بنائے جائیں۔

(۵) دونوں دولتوں کی طرف سے فضل ایک دوسرے کے پایۂ تخت میں رہا کریں تاکہ باہمی معاملات آسانی کے ساتھ طے ہوتے رہیں۔

نادر نے تخت نشین ہونے کے بعد بار بار سفیر عثمانی دربار میں بھیجے۔ مگر وہاں سے اس کے حسب منشا جواب نہ ملا۔ ۱۱۵۶ھ میں اس نے تیسری بار بغداد پر یورش کی تو وہاں کے والی احمد پاشا کے پاس برابر پیغام بھیجتا رہا کہ اس کے مطالبات تسلیم کیے جائیں۔ اس درمیان میں اس نے کرکوک وغیرہ کے متعدد قلعے فتح کر لیے۔ لیکن بغداد کو نہ لے سکا۔ آخر اس کے محاصرہ پر ایک کثیر فوج چھوڑ کر خود نجف اشرف کی زیارت کے لیے گیا۔ اور وہاں ایک عرصہ تک معہ لشکر و درگاہ و خیمہ و خرگاہ کے قیام رکھا۔

چونکہ صحرائے مغان کے عہد کی پوری تعمیل ابھی تک نہیں ہوئی تھی اور ہندوستان، افغانستان، ترکستان اور ایران کے مختلف العناصر مسلمان ایک دوسرے کی تکفیر سے باز نہیں آتے تھے۔ اس لیے اس نے تمام قلمرو میں فرمان بھیجا کہ مفتیان، علماء، امراء، اور رؤسا ہر ملک اور ہر طبقے کے دربار میں حاضر ہوں جب چہار سمت سے یہ لوگ نجف میں آ گئے تو اس نے ان سب سے پھر صحرائے مغان کے عہد کی تجدید چاہی اور ہر فرقہ کے علماء سے کہا کہ تم آپس کے تفرقے مٹا ڈالو۔ میں کسی طرح یہ جائز نہیں رکھ سکتا کہ میری سلطنت کے مسلمان باہم ایک دوسرے کو کافر بنائیں۔ اس نے احمد پاشا والی بغداد کے پاس لکھا کہ کسی ایسے ممتاز اور معتبر عالم کو بھیجدے جو ہمارے ان علماء کو ایک مرکز پر لا کر متحد کر سکے اور ان کے اختلافات کو مٹانے میں بطور حکم عادل کے شاہد رہے۔

احمد پاشا نے علامہ عبداللہ سویدی کو جو اس زمانے میں بغداد کے سب سے نامور عالم تھے اس کام کے لیے منتخب کیا اور نادر شاہ کے پاس بھیجا۔

علامہ موصوف نے وہ تمام باتیں جو اس مرحلہ میں پیش آئیں یا جو بحثیں ان کو کرنی پڑیں خود قلمبند کی تھیں مصر کے ایک مطبع نے اس کو الحجج القاطعہ فی اتفاق الفرق الاسلامیہ کے

نام سے شائع کیا ہے۔ ہم اس کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔ اسلم

۲۱ شوال ۱۱۵۶ھ یک شنبہ کے دن مغرب سے قبل میں اپنے گھر میں بیٹھا تھا کہ احمد پاشا والی بغداد کا ایک آدمی میرے بلانے کو آیا۔ میں مغرب کی نماز پڑھکر والی موصوف کے دربار میں گیا۔ وہاں ان کا ندیم احمد آغا ملا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ پاشا نے آپ کو کیوں طلب کیا ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں۔ بولا کہ پاشا آپ کو نادرشاہ کے حسب طلب اس کے دربار میں بھیجنا چاہتا ہے۔ جہاں ہر طرف سے علما عجم آکر جمع ہوئے ہیں۔ آپ کو ان کے ساتھ مذہب تشیع کے متعلق بحث کرنی ہوگی۔ اگر وہ غالب آگئے تو پھر پانچویں مذہب جعفری کی صحت کو تسلیم کر لینا پڑے گا۔

میں نے جو یہ بات سنی تو میرا بدن کانپ اٹھا اور کہا کہ احمد آغا! تم کو خوب معلوم ہے کہ نادر سخت جابر اور بڑا سفاک ہے۔ اس کے دربار میں علمار عجم کے ساتھ جو اسکے ہم مذہب ہیں میں کس طرح بحث کر سکوں گا۔ اور کیسے ان کے عقائد کے ابطال پر دلائل قائم کرنے کی جرأت کروں گا کیونکہ وہ نہ ہماری کسی حدیث کو مانتے ہیں نہ قرآن کی تاویل کو۔ پھر جب اصول موضوعہ اور علوم متعارفہ ہمارے اور ان کے ایک نہیں ہیں تو بحث کس بنیاد پر ہوگی؟ مثلاً فرض کرو کہ میں مسح علی الخفین (موزوں پر مسح) کے جواز پر یہ دلیل پیش کروں کہ اس کو ۸۰ صحابہ نے روایت کیا ہے جن میں سے حضرت علی رضؓ بھی ہیں وہ کہیں گے کہ عدم جواز کی روایتیں ہمارے یہاں ۱۰۰ صحابیوں سے مروی ہیں جن میں سے ابوبکر بھی ہیں۔ علیٰ ہذا ایک آیت کی تاویل بیان کر کے میں کسی روایت کی سند دوں گا تو وہ اس کے خلاف تاویل بیان کر کے اس کی سند کسی دوسری روایت سے دینگے لہٰذا جس طرح ممکن ہو احمد پاشا سے کہو کہ مجھے اس کام کے لیے نہ بھیجیں بلکہ حنفی یا شافعی مفتیوں میں سے کسی کو روانہ کریں۔ آغا نے کہا کہ یہ ناممکن ہے اور بہتر یہ ہے کہ اس میں آپ مطلق لب کشائی نہ کریں۔ کیونکہ پاشا نے آپ کو بھیجنے کا قطعی فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ سن کر میں دم بخود رہ گیا اس کے بعد خود احمد پاشا آگیا۔ اس نے سارا حال سنا کر مجھے شاہ کے پاس جانے کا حکم دیا اور کہا مجھے اللہ سے اُمید ہے کہ تمہاری حجت کو قوی کرے گا اور تم کو غلبہ عطا فرمائے گا۔ میں نے کہا لیکن نادرشاہ کی حالت تو آپ اچھی طرح سن چکے ہیں۔ پاشا نے کہا کہ ہاں۔ میں تم کو اس بارے میں آزاد چھوڑتا ہوں۔ موقع دیکھنا تو مناظرہ کرنا ورنہ باز رہنا۔ لیکن گریز کلیتہً نہ ہونی چاہیئے بلکہ مناسب طریقہ سے ان کا ابطال کرنا۔ ایسا نہ ہو کہ مغلوب ہو کر ان کے مذہب کی صحت

تسلیم کرلو۔ پھر کہا کہ کل دوشنبہ ہے چہارشنبہ کی صبح کو تم کو شاہ کے پاس موجود ہو جانا چاہیئے۔ اس لیے کل ہی صبح روانہ ہو جاؤ۔ اس کے بعد اس نے میرے لیے ایک خلعت کا حکم دیا اور سواری و خدام وغیرہ کا بندوبست کر دیا۔

دوسرے دن سویرے میں ان عجمیوں کے ساتھ جو بادشاہ کے یہاں سے آئے تھے روانہ ہو گیا۔ راستہ بھر اسی خیال میں غرق رہا۔ دلائل سوچتا تھا اور اس کے جواب۔ پھر جواب الجواب۔ یہاں تک کہ ہجوم افکار سے میرا سر چکرانے لگا اور شام کو جو مجھے پیشاب آیا تو سرخ خون کی طرح۔ اب ہم حلّہ ابن مزید میں پہنچے۔ یہ آبادی اس وقت ایرانیوں کے قبضے میں آچکی ہے۔ یہاں چند اہل سنت والجماعت سے ملاقات ہوئی جن کی زبانی معلوم ہوا کہ شاہ نے ایران کے ۷ مفتی جمع کئے ہیں جو سب کے سب شیعہ ہیں اور مذہب جعفری کی صحت پر دلائل پیش کرینگے۔ یہ بات سن کر مجھے اور پریشانی ہوئی۔ پھر میں نے سوچا کہ میں تو مختار ہوں بحث نہ کروں گا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ میرا دل ترکِ بحث پر مطلقاً راضی نہیں ہوتا۔ اب میں سوچنے لگا کہ صاف صاف کہوں گا کہ اگر بحث منظور ہے تو کسی ایسے ثالث کے سامنے ہو جو نہ سُنّی ہو نہ شیعہ ہو اور میں مناظرہ کروں گا خواہ اس میں میرے قتل ہی تک نوبت کیوں نہ پہنچے

وہاں سے چلکر ہم شہر ذی الکفل میں آئے اور آبادی سے باہر ہی ٹھہر کر کچھ دیر آرام لیا۔ رات کے پچھلے پہر روانہ ہو گئے اور نیر دندان میں پہنچکر فجر کی نماز پڑھی۔ فارغ ہوتے ہی نادر شاہ کا ایک قاصد دوڑتا ہوا آیا اور کہا کہ جلد چلیے آپ کا انتظار ہے۔ اس مقام سے شاہ کا مخیم دو فرسخ ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا شاہ کا یہی دستور ہے کہ جب کوئی آتا ہے تو اس کے استقبال کے لیے قاصد دوڑاتا ہے یا صرف اس موقع پر ایسا کیا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ کبھی نہیں۔ بلکہ لوگ آتے بھی ہیں تو عرصے تک ان کو باریابی نصیب نہیں ہوتی۔ راستہ سے بجز آپ کے آج تک شاہ نے کسی کو نہیں بلایا۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ اس عجلت سے بلانے کی غرض یہ ہو سکتی ہے کہ مجھ کو مذہب جعفری قبول کرنے پر مجبور کرے۔ پہلے ممکن ہے کہ دنیاوی لالچ دلائے۔ اگر میں نے اس کو قبول نہ کیا تو پھر سختی سے کام لیگا بہت کچھ استغفار توبہ اور لاحول وغیرہ پڑھنے کے بعد آخر میں نے اپنے دل میں یہ طے کر لیا کہ حق کا دامن نہیں چھوڑونگا

دین اسلام پہلی بار اس وقت رُک گیا تھا جب رسول اکرم کی وفات کے بعد ردّت کے معاملہ میں صحابہ نے ابوبکر کو تنہا چھوڑ دیا تھا۔ اللہ نے انہیں کی بدولت اس کو چلایا۔ پھر دوسری بار اس وقت رُکا جب خلیفہ مامون نے علماء کو خلق قرآن کے اقرار پر مجبور کیا اس وقت احمد بن حنبل جیسا امام کھڑا ہو گیا جس نے اس کو آگے بڑھایا۔

آج اگر میں بھی ان ہی مثالوں کی پیروی کروں تو کیا عجب ہے کہ حق قائم رہ جائے۔ ورنہ میرے ساتھ لاکھوں مسلمان گمراہ ہو جائیں گے۔

آخر میں موت کے لیے ہر طرح پر تیار ہو کر کلمۂ توحید و شہادت پڑھتا ہوا روانہ ہوا۔ کچھ دیر کے بعد دو اونچے اونچے جھنڈے نظر آنے لگے۔ معلوم ہوا کہ یہی شاہی معسکر ہے۔ وہاں پہنچکر دیکھا کہ بڑے بڑے سات ستونوں پر شاہی خیمہ کھڑا ہے۔ راستہ پر کشک خانہ ہے جس میں پندرہ پندرہ خیمے بالمقابل کھڑے کیے گئے ہیں۔ شاہی خیمہ کے متصل رواق (شامیانہ) ہے۔ دائیں سمت میں چار ہزار سپاہی حفاظت کے لیے رہتے ہیں۔ اور بائیں سمت میں خالی خرگاہیں ہیں جن میں کرسیاں وغیرہ رکھی ہیں۔

جب کشک خانہ کے قریب آیا تو وہاں ایک درباری میرے استقبال کے لیئے نکلا۔ اس نے مجھ سے بغداد کے امراء، رؤسا اور احمد پاشا اور اس کے متعلقین کے حالات نام بنام پوچھنے شروع کئے۔ میں اس کی واقفیت سے حیران ہوا۔ اس نے میرے تعجب کو دیکھ کر کہا کہ شاید آپ مجھے نہیں پہچانتے میرا نام عبدالکریم بیگ ہے میں مدتوں بغداد میں احمد پاشا کے پاس رہا ہوں۔ آج کل دولت عثمانیہ کی طرف سے شاہ کے پاس سفارت لے کر آیا ہوں اسی اثنار میں نو اشخاص ہماری طرف آتے ہوئے دکھائی دیئے عبدالکریم ان کی تعظیم کے لیے کھڑا ہو گیا۔ ان لوگوں نے مجھے سلام کیا۔ میں نے جواب دیا۔ عبدالکریم نے ان سب سے مجھ کو ملایا اور یکے بعد دیگرے ان کا تعارف کرانا شروع کیا کہ یہ حسن خاں معیار الممالک ہیں۔ یہ مصطفےٰ۔ یہ نظر علی خاں۔ یہ مرزا ذکی اور یہ مرزا کافی۔

معیار الممالک جو کرجی الاصل اور شاہ حسین کی موالی میں سے ہیں نادر شاہ کا وزیر ہے۔ سرسری ملاقات کے بعد یہ لوگ مجھے شاہ کے دربار میں لے چلے۔ شامیانہ کے دروازہ پر پہنچکر پردہ اٹھایا گیا۔ ان لوگوں نے مجھ سے کہا کہ جب ہم چلیں تو آپ بھی چلیں اور جب ہم ٹھہر جائیں تو آپ بھی ٹھہر جائیں۔ شامیانہ سے گزر گئے تو ایک طرف کشادہ جگہ دیکھی وہاں حرم کے خیمے تھے۔ سامنے ایک شاندار خیمے میں نادر کرسی پر بیٹھا ہوا نظر آیا جب اس کی نگاہ مجھ پر پڑی تو بلند آواز سے کہا، خوش آمدید عبداللہ آفندی۔ پھر قریب آنے کا حکم دیا۔ خوانین میرے دائیں طرف تھے اور عبدالکریم بائیں طرف۔ ہم سب دس قدم چل کر رک گئے۔ پھر شاہ نے کہا اور آگے آؤ۔ الغرض اسی طرح ہم چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر چلتے اور رکتے اس کے پاس پہنچ گئے۔ جب صرف پانچ ہاتھ کا فاصلہ رہ گیا تو ٹھہر گئے۔

شاہ کا قد بلند ہے۔ چہرہ سے بڑھاپا ٹپکتا ہے۔ آگے کے چند دانت بھی گر گئے ہیں۔ عمر تقریباً اسّی سال کی معلوم ہوتی ہے۔ ڈاڑھی حنا اور وسمہ سے رنگی ہوئی ہے۔ دونوں ابرو کمان کی طرح کشیدہ ہیں اور آنکھوں سے زردی نمایاں ہے ایک سفید چوگوشہ کلاہ عجمی سر پر ہے جس پر عمامہ ہے جو موتی، یاقوت الماس اور ہر قسم کے جواہر سے مزیّن ہے گلے میں موتی کے ہار ہیں اور قبا کے دونوں مونڈھوں پر جواہرات ٹکے ہوئے ہیں۔ الغرض وہ اپنی شکل ولباس کے باعث پرتمکنت وجلال معلوم ہوتا ہے۔ جب میں نے قریب سے اس کو دیکھا تو وہ تمام رعب جو اس کا میرے دل پر بیٹھا ہوا تھا جاتا رہا۔ اس نے ترکی زبان میں میرے ساتھ گفتگو شروع کی۔ پہلے احمد خاں (پاشا) کی خیریت دریافت فرمائی۔ پھر کہا کہ آپ کو معلوم ہے کہ میری سلطنت میں ترکستان وافغانستان بھی ہیں وہاں کے لوگ ایرانیوں کو کافر کہتے ہیں اور ایرانی ان کو کافر سمجھتے ہیں حالانکہ سب ایک ہی امّت کے ہیں اور ایک ہی دین کے پیرو۔ اسلیئے میں نہیں چاہتا کہ میری سلطنت میں ایسے مسلمان رہیں جو ایک دوسرے کو کافر بنائیں۔ میں نے آپ کو اسی غرض سے طلب کیا ہے کہ میری طرف سے وکیل بن کر ان کے باہمی مکفرات کو رفع کر دیجئے۔ اور ہر فرقہ کو پابند کر دیجئے کہ وہ ان امور سے باز آجائے جن سے کفر عائد ہوتا ہے تاکہ کوئی ان کو کافر نہ بنا سکے جو کچھ آپ دیکھیں اور سنیں اس کو مجھ سے بھی آکر کہیئے اور بغداد پہنچنے پر احمد پاشا کو بھی سنایئے

اس کے بعد ہم کو وہاں سے واپسی کی اجازت ملی۔ اور میری میزبانی کے لیے اعتماد الدولہ نامزد کیے گئے۔ میں وہاں سے نہایت خوش ہو کر نکلا کیونکہ میرا جو خطرہ تھا اس کے برخلاف شاہ نے سارے مذہبی اختیارات میرے ہاتھ میں دیدیئے۔ اب ہم اعتماد الدولہ کی طرف روانہ ہوئے۔ نظر علی خاں عبد الکریم بیگ اور ابوذر بیگ جو تینوں میری خدمت کے لیے مامور تھے۔ ساتھ ساتھ چلے۔ اعتماد الدولہ خیمہ میں بیٹھا ہوا تھا میں نے اس کو سلام کیا۔ اس نے جواب دیا لیکن بدستور بیٹھا رہا۔ میرے دل میں اس سے سخت انفعال اور غصّہ پیدا ہوا کہ اس شخص نے اپنی رعونت سے علم اور اہل علم کی اہانت کی اور میں سوچنے لگا کہ جب کہ نادر شاہ نے جملہ مکفرات کے اُٹھا دینے کا وکیل مطلق مجھے بنا دیا ہے۔ میں اس سے اس کی شکایت ضرور کروں گا۔ اور اس کفر کو جو اسلامی شان کے بالکل خلاف ہے سب سے پہلے مٹاؤں گا۔ مگر جونہی کہ میں بیٹھ چکا اعتماد الدولہ کھڑا ہوا اور اس نے ادب سے دونوں ہاتھ سینے پر رکھے اور میری طرف جھکتا ہوا مرحبا کہہ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ ایرانیوں کا تعظیمی دستور یہی ہے۔ لہٰذا اب اس کی طرف سے کوئی شکایت مجھے نہیں رہی۔

اعتماد الدولہ دراز قامت، سفید رو، اور کشادہ چشم ہے۔ ڈاڑھی پر حنا اور وسمہ کا خضاب کرتا ہے۔ عاقل نرم خو اور خلیق ہے۔

جب کھانے سے فارغ ہو چکے تو حکم آیا کہ میں ملّا باشی (درباری علّامہ ملّا علی اکبر) سے ملوں۔ میں سوار ہوا میرا نوکروں کی جماعت رفاقت میں تھی۔ راستہ میں ایک شخص افغانی لباس میں ملا۔ اس نے سلام کیا۔ میں نے پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ بولا کہ ملّا حمزہ افغانستان کا مفتی۔ میں نے کہا کہ شاہ نے مجھ کو وکیل مطلق بنایا ہے کہ ایرانیوں سے ہر قسم کے مکفرات اٹھا دوں۔ تم چوں کہ سنّی ہو اس لیے میں تم سے امید رکھتا ہوں کہ اگر وہ کوئی فعل اس قسم کا کرتے ہوں جو منجر بہ کفر ہو اور مجھ سے اس کو چھپائیں تو مجھے مطلع کر دینا کیونکہ میں ان کے حالات، عقائد اور عبادات سے اس قدر واقف نہیں ہوں جس قدر کہ تم لوگ ہو۔

مُلّا حمزہ نے کہا کہ آپ شاہ کی باتوں سے دھوکے میں نہ آجائیں درحقیقت اس نے آپ کو ملّا باشی کے پاس اس غرض سے بھیجا ہے کہ وہ مناظرہ کرے۔ ایران کے تمام علماء اس کا ساتھ دیں گے۔ لہٰذا آپ ہوشیار رہیں۔ میں نے کہا کہ مجھے بحث کا زیادہ خطرہ نہیں ہے۔ صرف ڈر یہ ہے کہ وہ ناانصافی نہ کریں یا جو کچھ مجلس مناظرہ میں میں کہوں اس کے خلاف شاہ سے جا کر بیان کریں۔ اس نے کہا کہ اس سے آپ خاطر جمع رہیں۔ اس مجلس میں شاہ کے مخبر ہیں۔ پھر ان مخبروں پر مخبر ہیں۔ ان کے علاوہ خاص جاسوس ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک لفظ بھی خلاف واقعہ شاہ کے سامنے کوئی بیان کر سکے۔

اب ہم ملّا باشی کے خیمہ کے قریب پہنچ گئے۔ وہ منتظر تھا۔ استقبال کے لیے نکلا۔ گندم گوں اور پستہ قد آدمی ہے۔ مجھ کو لے جا کر صدر پر بٹھایا۔ اور خود سامنے شاگردوں کی طرح ادب کے ساتھ بیٹھ گیا۔ مجمع کثیر تھا۔ ہر ملک کے علما جمع تھے۔ پہلے اس نے مجھ سے رسمی باتیں کیں۔ اس کے بعد افغانی مفتی کو مخاطب کر کے کہا کہ تم نے ہادی خواجہ (قاضی بخارا) کو دیکھا؟ اس نے جواب دیا کہ ہاں۔ ——— ملّا باشی نے کہا کہ مجھے تعجب ہے کہ اس نے اپنا لقب بحر العلم کیوں رکھا ہے اس کو تو علم سے ذرا بھی مس نہیں۔ بخدا اگر میں حضرت علیؓ کی خلافت کے متعلق دو دلیلیں بھی بیان کروں تو وہ ان کا جواب نہیں دے سکے گا۔ اور وہ کیا اہلِ سنّت کے علماء مغول سے بھی ان کا جواب بن نہ پڑے گا۔ اس آخری جملہ کو اس نے تین بار دُہرایا۔ اس لیے لازم آگیا کہ میں ان دونوں دلیلوں کو پوچھوں اور

ان کے جوجواب ہو سکتے ہیں پیش کروں۔

میں:۔ جناب ذرا میں بھی سنوں کہ حضرت علیؓ کی خلافت کے ثبوت میں آپ کی وہ کونسی دو دلیلیں ہیں جن کا جواب آپ کے خیال میں کسی بڑے سے بڑے سنّی عالم سے بھی نہیں ہو سکتا۔

مُلّا باشی:۔ میں آپ سے پہلے یہ پوچھ لینا چاہتا ہوں کہ آنحضرت کا یہ قول حضرت علیؓ کے متعلق آپ کے یہاں مسلّم ہے یا نہیں کہ انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ الّا انہ لا نبی بعدی" (تم میرے ساتھ وہ نسبت رکھتے ہو جو ہارون کو موسےٰ کے ساتھ تھی مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔)

میں:۔ ہاں یہ حدیث مشہور ہے۔

مُلّا باشی:۔ تو کیا اس حدیث کا منطوق و مفہوم صریحًا اس امر پر دلالت نہیں کرتا کہ خلیفۂ برحق علی ابن ابی طالب ہیں؟۔

میں:۔ دلیل کی صورت معرض بیان میں لائیے۔

مُلّا باشی:۔ جب آنحضرتؐ نے ہارونؑ کے تمام منازل و مراتب حضرت علی کے لیے فرما دیئے اور ان میں سے کوئی چیز بجز نبوت کے مستثنیٰ نہ کی تو ثابت ہو گیا کہ خلیفۂ برحق حضرت علیؓ ہیں کیونکہ ہارون کا اولین مرتبہ تو خلافت ہی تھا اگر وہ زندہ رہتے تو ضرور حضرت موسیٰ کے بعد ان کے خلیفہ ہوتے۔

میں:۔ آپ کے اس کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس کو قضیہ موجبہ کلیہ سمجھتے ہیں لہٰذا یہ بتائیے کہ اس ایجاب کلی پر کونسا لفظ دلالت کرتا ہے کہ ہارون کے تمام منازل حضرت علیؓ کو حاصل ہیں۔

مُلّا باشی:۔ اس لیے کہ منزلۃ ھارون میں جو اضافت ہے وہ بقرینہ استثنا استغراقی ہے۔

میں:۔ سنیئے۔ یہ حدیث اولاً تو نص جلی نہیں ہے اور آپ کے یہاں امامت یا خلافت کے ثبوت کے لیے نص جلی درکار ہے۔ ثانیاً محدثین نے اس کے متعلق اختلافات کیے ہیں کسی نے اس کو صحیح کہا ہے کسی نے حسن اور کسی نے ضعیف۔ یہاں تک کہ ابن جوزی نے جو نقد حدیث کا بہت بڑا امام ہے اس کو قطعًا موضوع قرار دیا ہے۔

مُلّا باشی:۔ نص جلی ہمارے یہاں شرط ہے نہ کہ آپ کے یہاں سو ہم حضرت علیؓ کی خلافت کے لئے دوسری

حدیثیں پیش کرتے ہیں جو لفظ جلی ہیں لیکن چونکہ اہل سنت کے نزدیک وہ نامقبول ہیں اس لیے ان کے واسطے اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔

میں :۔ یہ حدیث مختلف وجوہ سے دلیل نہیں بن سکتی۔ اولاً یہ کہ استغراق کا دعوےٰ جو آپ نے کیا وہ ممنوع ہے۔ کیونکہ ہارونؑ حضرت موسیٰؑ کے ساتھ نبی تھے اور حضرت علیؓ میں یہ بات نہ تھی حالانکہ استثنا تو نبوت بعد از وفات کا ہے ثانیاً ہارون حضرت موسیٰؑ کے ماں جائے بھائی تھے اور حضرت علیؓ نبی کے ساتھ یہ رشتہ نہیں رکھتے تھے۔ لہٰذا استغراق کا دعویٰ تو قطعاً باطل ہوا۔ اب اس کی دلالت ظنی رہ گئی جو اولاً صرف ایک منزلت پر ہوگی۔ جیسا کہ منزلۃ کی تار وحدت سے خود ظاہر ہے اسلیے یہ اضافت عہد ہے نہ کہ استغراق اور مقصود یہ ہے کہ علیؓ خلافت جنگ تبوک میں میرے ساتھ وہی نسبت رکھتے ہیں جو حضرت ہارونؑ کو حضرت موسےٰؑ کے ساتھ اس وقت تھی جب انہوں نے حکم دیا تھا "اُخْلُفْنِی فِی قَوْمِی" (میری قوم میں میری جانشینی کر)

مُلّا باشی :۔ تو پھر کیا اس استخلاف سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ صحابہ میں افضل تھے اور نبی کے بعد انکی جانشینی کے سب سے زیادہ مستحق۔

میں :۔ نہیں۔ کیوں کہ حضرت علیؓ کے علاوہ اور صحابہ کو بھی آپ نے اپنی جانشینی کا زندگی میں شرف بخشا ہے مثلاً ابن ام مکتوم وغیرہ کو۔ پھر وہ بھی بعد وفات کے اس دلیل سے خلافت کے سب سے زیادہ مستحق ہونگے علاوہ بریں اگر یہ استخلاف کوئی فضیلت ہوتی تو حضرت علی اس پر ناراضی کا اظہار نہ کرتے جیسا کہ انھوں نے کہا کہ آپ مجھ کو کمزوروں بچوں اور بوڑھی عورتوں کے ساتھ چھوڑتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی اسی کبیدگی کو دفع کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فقرہ "انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ" فرمایا تھا۔

مُلّا باشی :۔ لیکن لحاظ عموم لفظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوص سبب کا۔

میں :۔ خصوص سبب کو میں نے دلیل نہیں گردانا ہے بلکہ اس کو قرینہ بتلایا ہے کہ یہاں ایک منزلت جو مراد ہے اس سے صرف وہی خلافت مخصوصہ؟ جنگ تبوک ہے نہ کہ اور کوئی خلافت اس کے بعد

ملّا باشی خاموش رہ گیا اور اس کے کثیر طرف دار علماء میں سے بھی جو اس کی حمایت کے لیے پس پشت بیٹھے ہوئے تھے کوئی آواز بلند نہ ہوئی۔ اب اس نے اپنی دوسری دلیل شروع کی اور کہنے لگا کہ میری دوسری دلیل تو ایسی ہے کہ اس میں قطعاً کسی تاویل کی گنجائش نہیں۔

میں :- اس کو بھی بیان فرمائیے۔

ملا باشی :- وہ آیت مباہلہ ہے قُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ (کہدے کہ آؤ ہم بلائیں اپنے بیٹوں کو اور تمہارے بیٹوں کو اور اپنی عورتوں کو اور تمہاری عورتوں کو اور اپنے آپ کو اور تم کو پھر مباہلہ کریں)

میں :- استدلال کی شکل بیان کیجئے۔

ملا باشی :- جب نجران کے نصاریٰ مباہلہ کے لیے آئے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے گود میں حسینؑ کو اٹھایا حسن کا ہاتھ پکڑا۔ پیچھے فاطمہؑ تھیں اور ان کے پیچھے علی رضی اللہ عنہم۔ ظاہر ہے کہ دعا کے لیے وہی لوگ منتخب ہو سکتے ہیں جو سب سے افضل ہوں۔

میں :- یہ منقبت ہوئی نہ کہ فضیلت۔ اکثر صحابہ بعض خصوصیات سے مختص ہیں جو دوسروں میں نہیں ہیں اور یہ باتیں ان لوگوں سے مخفی نہیں ہیں جو تاریخ و سیر کا مطالعہ کرتے ہیں مگر یہ خصوصیات فضیلت کی دلیل ہرگز نہیں ہو سکتیں۔ فرض کرو کہ دو قبیلوں میں جنگ ہو۔ ان دونوں کے رؤسا صرف اپنے اپنے خاص خاص متعلقین کو ساتھ لے کر مبارزہ کریں تو یہ دلیل اس امر کی نہیں ہو سکتی کہ ان قبیلوں میں ان رؤسا کے خاص عزیزوں سے بڑھ کر کوئی بہادر نہ تھا اور یہ چونکہ دعا کا موقع تھا جس میں خاص متعلقین کی موجودگی سے خشوع زیادہ بڑھ جاتا ہے اس لیے مقتضائے مقام یہی تھا کہ آنحضرت انہیں حضرات کو اپنے ساتھ لے جاتے۔

ملّا باشی :- ہاں تو خشوع نتیجہ ہے فرط محبت کا اور ہم یہی تو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ آنحضرت کو یہی حضرات سب سے زیادہ محبوب تھے۔

میں :- یہ طبعی اور جبلّی محبت ہے نہ کہ اختیاری جس سے کوئی فضیلت ثابت ہو سکے انسان یہ یقین رکھتے ہوئے

کہ اس کے بیٹوں یا خاص عزیزوں سے دوسرے لوگ ہر لحاظ سے افضل ہیں پھر بھی طبعًا ان کی محبت پر مجبور رہے اور یہ ایسی بات ہے جس کو سب جانتے ہیں۔

مُلّا باشی :۔ حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں ایک خاص نکتہ ہے جس کی وجہ سے ہم حضرت علیؓ کی افضلیت کی دلیل اس کو سمجھتے ہیں۔ وہ یہ کہ ابنائنا سے مراد ہیں حسنؓ و حسینؓ نسائنا سے فاطمہ اور انفسنا سے آنحضرتؐ اور علیؓ۔ اس لیے حضرت علیؓ نفس نبی ہوئے اور یہ انتہائی فضیلت ہے۔

میں :۔ یہ تو میں پہلے سمجھ گیا تھا کہ تم اصول سے ناواقف ہو لیکن اب معلوم ہوا کہ عربیت سے بھی ناآشنا ہو۔ سنو! انفس جمع قلت ہے جو جمع متکلم کی طرف مضاف ہو اور جمع جب جمع کی طرف مضاف ہوتی ہے تو تقسیم احاد کی مقتضی ہوتی ہے مثلاً "رکب القوم دوابھم" اس کے یہ معنے نہیں کہ جملہ اشخاص سب گھوڑوں پر چڑھ گئے بلکہ ہر ہر شخص اپنے اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور یہ قاعدہ متعارف و متداول ہے اور کتب نحو میں بہ تصریح مذکور۔

یہ سن کر وہ خاموش ہو گیا اور کوئی جواب اس سے بن نہ پڑا۔ کہنے لگا میرے پاس ایک دلیل اور بھی ہے میں نے کہا کہ اسے بھی پیش کیجیے۔

ملا باشی :۔ آیت اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ کی تفسیر میں جملہ اہل تفسیر کا اتفاق ہے کہ حضرت علی کے متعلق نازل ہوئی ہے اور آیت میں انما کلمۂ حصر ہے جس سے ان کا افضل امت ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

میں :۔ اس دلیل کے متعدد جوابات ہیں۔

میں اسی قدر کہنے پایا تھا کہ اس کے ساتھیوں میں سے ایک نے فارسی زبان میں اس سے کہا کہ یہ بحث چھوڑ دو۔ کیوں کہ یہ شخص تمہاری ہر دلیل کو توڑتا چلا جائے گا اور لوگوں کی نگاہوں میں تم اسی قدر گرتے جاؤ گے یہ سن کر اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا کہ آپ فاضل شخص ہیں۔ میری ہر دلیل کا جواب دے سکتے ہیں لیکن میرا روئے سخن تو دراصل بحر العلم کی طرف تھا۔ میں نے کہا کہ آغاز سخن میں آپ نے فرمایا تھا کہ فحول علماء اہل سنت بھی میری دلیلوں کا جواب نہیں دے سکتے اس بنا پر میں نے گفتگو کی ورنہ مجھے کوئی بحث نہ تھی۔

ملا باشی :۔ میں عجمی شخص ہوں۔ عربی بولنے میں کبھی کبھی مقصود کے خلاف بھی الفاظ میری زبان سے نکل جاتے ہیں

میں :- اچھا اب میں دو سوال کرتا ہوں جس کی بابت مجھ کو یقین ہے کہ علماء شیعہ میں سے کوئی بھی ان کا جواب نہ دے سکے گا۔

ملّا باشی :- وہ کیا ہیں ؟

میں :- کیا تمہارے یہاں یہ روایت مسلم نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد تمام صحابہ (بجز حضرت علی کی خلافت پر بیعت نہ کرنے کے) مرتد ہو گئے۔ بجز پانچ کے۔ حضرت علی۔ مقداد۔ ابو ذر۔ سلمان فارسی اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم۔

ملّا باشی :- ہاں مسلم ہے۔

میں :- اگر معاملہ یہ تھا تو پھر کیوں حضرت علیؓ نے اپنی بیٹی ام کلثوم کا نکاح حضرت عمر کے ساتھ کیا ؟

ملّا باشی :- مجبوراً دیا ہوگا۔

میں :- بخدا تم نے حضرت علی کی ایسی منقصت پر عقیدہ رکھا ہے جس کو ادنیٰ عرب بلکہ اجلاف بازاری بھی اپنے لیے جائز نہ رکھیں گے۔ اگر جبراً کسی کی بیٹی کو کوئی بیاہ لے تو کیا اس کی زندگی بے غیرتی کی زندگی نہیں ہے ؟ پھر تم کیسے دعوے کر سکتے ہو کہ حضرت علی اسد اللہ۔ شیر خدا۔ شاہ مرداں اور شجاع دوراں تھے۔

ملّا باشی :- یہ بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ حضرت عمر کے یہاں بجائے ام کلثوم کے کوئی چڑیل یا بھتنی رخصت کی گئی ہو

میں :- یہ جواب اس سے بھی عجیب تر ہے اگر اس احتمال کا دروازہ کھولا جائے تو شریعت کا کوئی نقطہ اپنی جگہ پر باقی نہیں رہ سکتا۔ مثلاً ایک شخص اپنی منکوحہ کے پاس جاتا ہے وہ کہتی ہے کہ ممکن ہے کہ تم میرے شوہر نہ ہو بلکہ جن یا بھوت ہو۔ اگر وہ دو گواہ پیش کرے تو وہ کہہ سکتی ہے کہ ممکن ہے کہ یہ انسان نہ ہوں بلکہ غول بیابانی ہوں۔ علی ہذا ایک قاتل عدالت میں پیش کیا جائے وہ بیان کرے کہ میں نے قتل نہیں کیا ممکن ہے کہ کوئی جن میرا ہمشکل بن گیا ہو۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ مذہب جعفری جس کو تم حق سمجھتے ہو ممکن ہے کہ امام جعفر سے نہ مروی ہو بلکہ کسی جن سے ہو جس نے ان کی شکل اختیار کر لی ہو۔ الغرض وہ اب کے بھی ساکت ہوا۔ اور ایک حرف آگے نہ چل سکا۔ اب میں نے دوسرا سوال پیش کیا اور پوچھا کہ ظالم خلیفہ کے افعال کی بابت تمہارا کیا عقیدہ ہے ؟

ملا باشی :- غیر نافذ ہیں شرعاً اور دیانتاً ۔

میں : یہ بتایئے کہ حضرت علی کے بیٹے محمد بن الحنفیہ کی والدہ کس قبیلہ کی تھیں ؟ اور کس نے ان کو مالِ غنیمت میں حاصل کیا تھا ؟

ملّا باشی :- میں نہیں جانتا (میرے خیال میں اس نے صحیح نہیں کہا کیونکہ ممکن نہیں کہ وہ اس بات کو نہ جانتا ہو) لیکن علمائے شیعہ میں سے ایک نے کہا کہ وہ بنی حنیفہ میں سے تھیں ۔ اور حضرت ابو بکر کے عہد میں ان کی حکم سے بنی حنیفہ کے ساتھ جو لڑائی ہوئی تھی اس میں گرفتار ہو کر قیدیوں کے ساتھ آئی تھیں ۔

میں :- پھر حضرت علیؑ نے یہ کیسے جائز سمجھا کہ خلیفۂ ظالم کے مالِ غنیمت میں سے کنیز لے کر اس سے اولاد پیدا کریں ۔ اس معاملہ میں تو نہایت احتیاط کی ضرورت تھی ۔

ملّا باشی :- ہو سکتا ہے کہ حضرت علیؑ نے اس کو خود بنی حنیفہ سے بطور ہبہ کے مانگ لیا ہو ۔

میں :- اس کی کوئی دلیل ؟

اس پر ہر طرف خاموشی تھی ۔

میں :- میں نے قصداً احتیاط رکھی کہ کوئی حدیث یا کوئی آیت آپ کے سامنے پیش نہ کروں اس لیے کہ ممکن ہے کہ ہم دونوں اس کی صحت یا اس کی تاویل میں متفق نہ ہوں ۔ اور استدلال صرف انھیں باتوں سے ہو سکتا ہے جو فریقین کے نزدیک مسلم ہوں ۔ میرے یہ دونوں سوالات عقل و عرف کی بنا پر تھے ۔

اس مناظرہ کی لفظ بہ لفظ صحیح صحیح خبریں شاہ تک پہنچ گئیں ۔ اس نے حکم دیا کہ جملہ علما ربا ہم جمع ہو کر مکفرات کو اُٹھا دیں اور ایک دوسرے کی تکفیر سے دست بردار ہو جائیں اور میں ان کا حکم رہوں ۔ اس لیے ہم سب ملّا باشی کے خیمہ سے نکلکر اس مجمع کی طرف چلے جو ضریح علیؓ کے متصل اس غرض کے لیے جمع ہوا تھا ۔

علمارِ ایران کی تعداد ۷۰ تھی جن میں سے صرف ایک شخص مفتی اردلان سنی تھا اور باقی سب شیعہ ۔ ان میں ممتاز حضرات کے نام میں نے اسی وقت لکھ لئے تھے ۔

(۱) ملا باشی علی اکبر (۲) مفتی رکاب آقا حسین (۳) ملا محمد امام لاہجان (۴) آقا شریف مفتی مشہد رضا (۵) مرزا برہان قاضی شروان (۶) شیخ حسن مفتی اردبیہ (۷) مرزا ابو الفضل مفتی قم (۸) حاجی صادق مفتی جام

(۹) سید محمد مہدی امام اصفہان (۱۰) حاجی محمد زکی کرمانشاہ (۱۱) حاجی محمد ثمامی مفتی شیراز (۱۲) مرزا اسد اللہ مفتی تبریز (۱۳) ملا طالب مفتی مازندران (۱۴) ملا محمد مہدی نائب صدر مشہد (۱۵) ملا محمد صادق مفتی خلخال (۱۶) محمد مومن مفتی استرآباد (۱۷) سید محمد تقی مفتی قزوین (۱۸) ملا محمد حسین مفتی سبزوار (۱۹) سید بہاء الدین مفتی کرمان (۲۰) سید احمد مفتی اردلان شافعی۔

افغانستان کے علما جو سب کے سب حنفی تھے حسب ذیل تھے۔

(۱) شیخ فاضل ملا حمزہ قلنجانی مفتی افغانستان (۲) ملا امین قلنجانی قاضی افغانستان (۳) ملا وینا غلقی (۴) ملا طہٰ افغانی مدرس مدرسہ نادر آباد (۵) ملا محمد قلنجانی (۶) ملا عبدالرزاق قلنجانی (۷) ملا ادریس ابدالی۔

تھوڑے عرصہ کے بعد علماء ترکستان آئے جن کی تعداد سات تھی۔ ان کے آگے ایک شیخ تھا جس کے چہرہ سے رعب اور وقار برستا تھا ایک بڑا عمامہ سر پر۔ دیکھنے والے کو خیال گزرتا تھا کہ امام اعظم کے شاگرد رشید امام یوسف چلے آرہے ہیں۔ ایرانیوں نے اس خیال سے کہ میں ان سے کوئی بات نہ کرسکوں۔ مجھ سے پندرہ آدمیوں کے فاصلے پر بائیں طرف ان کو بٹھایا۔ اسی طرح افغانی علماء کو بھی دائیں طرف مجھ سے دور جگہ دی۔ ترکستانی علما کے نام یہ ہیں۔

(۱) علامہ ہادی خواجہ بحر العلم قاضی بخارا حنفی (۲) میر عبداللہ صدور بخارا حنفی (۳) قلندر خواجہ بخاری حنفی (۴) ملا امید صدور بخاری حنفی (۵) بادشاہ میر خواجہ بخاری حنفی (۶) مرزا خواجہ بخاری حنفی (۷) ابراہیم بخاری حنفی۔

جب مجلس بیٹھ چکی ملا باشی نے بحر العلم کو مخاطب کیا اور کہا آپ اس شخص (میری طرف اشارہ کرکے) کو پہچانتے ہیں۔ بحر العلم نے کہا کہ نہیں۔ ملا باشی نے کہا کہ یہ فضلاء اہل سنت میں سے ہیں شیخ عبداللہ آفندی۔ ان کو احمد پاشا والی بغداد نے شاہ کے حسب طلب بھیجا ہے تاکہ اس مجلس میں ہمارے نگران اور شاہد رہیں۔ شاہ نے ان کو اپنا وکیل بنا دیا ہے۔ جن امور پر ہمارا اتفاق ہوتا جائے گا یہ شاہد رہیں گے۔ لہٰذا آپ ان تمام امور کو بیان کریں جن کی بنا پر ہم شیعوں کی تکفیر کرتے ہیں تاکہ اگر واقعی وہ موجب کفر ہوں تو ہم ان سے باز آجائیں ورنہ حقیقت میں تو ہم کافر نہیں ہیں خود امام ابوحنیفہ کے نزدیک بھی۔ چنانچہ جامع الاصول میں ہے کہ اسلام کے پانچ مذاہب ہیں جن میں سے ایک مذہب جعفری بھی ہے۔ اسی طرح صاحب مواقف نے بھی امامیہ کو اسلام کا ایک فرقہ تسلیم کیا ہے اور امام ابو حنیفہ رح کا قول فقہ اکبر میں ہے کہ ہم اہل قبلہ کو کافر نہیں سمجھتے۔ شرح ہدایہ میں یہ تصریح موجود ہے کہ صحیح یہ ہے

کہ امامیہ اسلام ہی کا ایک فرقہ ہے لیکن باوجود متقدمین کی ان تصریحات کے بھی متاخرین نے غلو اور تعصب سے کام لے کر ہم کو کافر بنانا شروع کیا جس طرح ہمارے فرقہ کے لوگوں نے آخر میں سنیوں کی تکفیر شروع کردی۔ حالانکہ نہ ہم کافر ہیں نہ تم۔ بہرصورت ہمارے اندر کفر کی جو باتیں آپ کے خیال میں ہوں ان کو ظاہر کیجئے۔

بحر العلم:۔ سب شیخین۔

ملا باشی:۔ ہم نے اس کو چھوڑا

بحر العلم:۔ تم صحابہ کرام کو کفار، مرتد اور گمراہ کہتے ہو۔

ملا باشی:۔ سارے صحابہ عدول ہیں۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ

بحر العلم:۔ متعہ کو حلال سمجھتے ہو۔

ملا باشی:۔ متعہ حرام ہے جو اس کی حلت کا قائل ہو وہ سفیہ ہے۔

بحر العلم:۔ تم علی رضؓ کو ابوبکر رضؓ پر فضیلت دیتے ہو اور کہتے ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہی خلیفہ برحق تھے

ملا باشی:۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت میں سب سے افضل ابوبکر رضؓ۔ پھر عمر رضؓ۔ پھر عثمان رضؓ۔ پھر علی رضؓ رضی اللہ عنہم ہیں اور ان کی خلافتیں بھی اسی ترتیب کے ساتھ ہیں۔

بحر العلم:۔ تمہارا اصول اور عقیدہ کیا ہے؟

ملا باشی:۔ ہم ابوالحسن اشعری کے عقیدہ پر ہیں۔

بحر العلم:۔ شرط یہ ہے کہ شرع کی کسی حلال چیز کو حرام یا حرام کو حلال نہ بناؤ۔

ملا باشی:۔ یہ شرط منظور ہے۔

بحر العلم نے اس کے بعد کچھ اور شرطیں بھی پیش کیں جن کو کفر سے علاقہ نہ تھا۔ ملا باشی نے ان سب کو قبول کیا پھر کہا کہ جب ان سب امور کے ہم پابند ہو گئے تو اب تم کو ہمارے مسلمان شمار کرنے میں کیا عذر ہے؟

بحر العلم:۔ شیخین پر تبرا کفر ہے۔

ملا باشی:۔ ہم نے اس کو چھوڑا۔

بحر العلوم :- (کچھ دیر تک سکوت کے بعد) لیکن شیخین کو بُرا کہنا تو کفر ہے۔

ملّا باشی :- جناب ہم نے تو اس کو چھوڑ دیا پھر بھی آپ ہم کو کفّار ہی کہتے رہیں گے۔

بحر العلوم :- بہر صورت سب شیخین تو کفر ہے۔

مراد بحر العلوم کی یہ تھی کہ سبّ شیخین چونکہ کفر ہے[1] اور جس سے کفر صادر ہو مذہب حنفی کے مطابق اس کی توبہ قبول نہیں۔ پھر میں کیسے تسلیم کرلوں کہ شیعہ مسلمان ہیں جب کہ یہ کفر اُن سے سرزد ہو چکا ہے۔

آخر مفتی افغان ملّا حمزہ نے کہا کہ ہادی خواجہ! کیا تمہارے پاس کوئی ثبوت موجود ہے کہ ان سے سبّ شیخین کا کفر صادر ہوا ہے جو تم ان کی توبہ نہیں قبول کرتے۔ بحر العلوم نے کہا کہ نہیں۔ ملا حمزہ نے کہا کہ جب وہ حمیّتی وعدہ کرتے ہیں کہ ہم تبرّا نہ کہیں گے تو پھر اس کے قبول کر لینے میں کونسی شے مانع ہے۔ اس پر بحر العلوم نے کہا کہ اچھا۔ یہ لوگ بھی مسلمان ہیں جو ہمارے حقوق وہ ان کے حقوق۔

جب یہ بات طے ہوگئی تو شیعہ حنفی اور شافعی تینوں فرقوں کے علماء امراء اور اعیان کھڑے ہو گئے باہم مصافحہ اور معانقہ کرنے لگے اور ایک دوسرے سے بچھڑے ہوئے بھائیوں کی طرح بغلگیر ہونے لگے۔

اس وقت ہمارے پس پشت اردگرد عجمی امراء اور تماشائیوں کا ہجوم دس ہزار سے کم نہ تھا جو سب کے سب جوش سرور اور فرط مسرت سے آپس میں ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے تھے۔

یہ مجلس بحسن و خوبی چہار شنبہ کے دن مغرب سے پہلے ختم ہوگئی۔ رات کو دس بجے شاہ کی طرف سے ایک آدمی آیا جس نے کہا کہ شہنشاہ آپ کو سلام کہتے ہیں اور آپ کی مساعی کے شکر گزار ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ کل کی مجلس میں جب آج کی باتوں کا عہد و پیمان ہوگا اور ہر فریق محضر پر دستخط کرے گا آپ بطور شاہد اور میرے وکیل کے موجود رہیں گے اور محضر کی پیشانی پر خود اپنے قلم سے اپنی شہادت تحریر کریں گے اور مہر لگائیں گے۔

میں نے کہا کہ بسر و چشم میں اس حکم کی تعمیل کروں گا۔

دوسرے دن یعنی پنجشنبہ ۲۵ شوال کو ضریح علیؑ کے سامنے دوپہر سے پہلے اجتماع ہوا۔ ہم سب لوگ وہاں پہنچے حاضرین کی تعداد کم سے کم ساٹھ ہزار تھی۔ محضر نامہ سات بالشت کے کاغذ پر فارسی زبان میں لکھا گیا تھا

---

[1] لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ سبّ شیخین کفر ہے نہ ناقابلِ توبہ۔ یہ فتاوے جن لوگوں نے دئے ہیں ان کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ خاص خاص اسباب سے وہ شیعوں سے ذاتی تعصب اور عداوت رکھتے تھے۔ اسلم

ملا باشی نے مفتی رکاب آقا حسین کو جو بلند آواز شخص تھا اس کے سنانے کا حکم دیا اس نے مجمع عام میں پڑھا۔ اس کا مضمون یہ تھا۔

"اللہ جل شانہٗ اس دنیا میں سلسلہ وار رسول بھیجتا رہا۔ سب کے آخر میں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نے اپنا رسول بنا کر بھیجا جن پر رسالت ختم کر دی۔ ان کی وفات کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بالاتفاق ابو بکر صدیق ابن ابی قحافہ کو ان کا جانشین بنایا اور ان کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی۔ حضرت علی رضؓ نے بھی بطیب خاطر بلا جبر و اکراہ بیعت فرمائی۔ اور باجماع صحابہ وہ امت کے امیر اور خلیفہ ہو گئے پھر انہوں نے بذریعہ عہد کے عمر بن خطابؓ کو اپنا جانشین کیا۔ ان کے ہاتھ پر بھی جملہ اصحاب نے معہ حضرت علیؓ کے خوشی کے ساتھ بیعت کی۔ عمر رضؓ نے خلافت کو اپنے بعد چھ امیدواروں میں بطور شوریٰ کے چھوڑ دیا جن میں سے ایک علیؓ بن ابی طالب بھی تھے۔ کثرت رائے سے حضرت عثمانؓ خلیفہ ہو گئے۔ جب وہ اپنے گھر میں باغیوں کے ہاتھ سے شہادت پا گئے اور امت بلا خلیفہ کے رہ گئی۔ اس وقت صحابہ نے حضرت علی کو خلیفہ بنایا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔

یہ چاروں خلیفہ ایک زمانے میں تھے۔ ان میں کبھی باہم کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ بلکہ ایک دوسرے کی ساتھ محبت رکھتا تھا اور اس کی تعریف کرتا تھا۔ یہاں تک کہ جب علی رضؓ سے شیخین کی بابت سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ وہ دونوں امام عادل اور برحق تھے اور اسی پر مرے۔ اسی طرح جب حضرت ابو بکرؓ کے ہاتھ پر لوگ بیعت کرنے لگے تو انہوں نے فرمایا کہ تم میں علی موجود ہیں۔ پھر بھی تم میرے ہاتھ پر بیعت کرتے ہو۔

اہل ایران تم کو یقین رکھنا چاہیئے کہ ان کی افضلیت اور خلافت اسی ترتیب پر ہے جس طرح بیان کی گئی۔ سو جو شخص ان کی تحقیر یا ان کی بابت کوئی ناشائستہ کلمہ زبان سے نکالے گا۔ اس کا مال، اولاد اور خون سب شہنشاہ کے لیے حلال ہوگا اور اس کے اوپر اللہ ملائکہ اور جملہ بنی نوع انسان کی لعنت ہوگی۔

میں نے صحرا مغان میں تخت نشینی کے وقت یہی عہد لیا تھا۔ اب جو کوئی صحابہ کو برا یا شیخین پر تبرا

کہے گا اس کو اس کے اہل وعیال سمیت قید کروں گا اور مال وجائداد ضبط کرلوں گا ۔ یہ بدعت ایران میں کبھی نہیں تھی ۔ اس کا ظہور اسماعیل شاہ صفوی کے عہد ۹۰۷ھ سے ہوا جواب تمام ملک میں پھیلی ہوئی ہے ۔"

یہ حصہ شاہ کی طرف سے تھا ۔ اس کے نیچے چند سطریں تھیں جن میں باشندگان ایران کی طرف سے عہد تھا کہ :-

"ہم صحابہ کو برا نہ کہیں گے ۔ اور تبرے سے دست بردار ہوئے ۔ خلفائے اربعہ کی فضیلت اور خلافت کے ہم اسی ترتیب کے ساتھ قائل ہیں جو اس محضر میں مندرج ہے جو اس کے خلاف کرے اس پر اللہ کی، فرشتوں کی اور سارے آدمیوں کی لعنت ہو اور شہنشاہ کے لیے اس کا مال، عیال اور خون حلال ہے ۔"

اس کے نیچے علماء اور عمائد ایران کے دستخط ہوئے اور ان کی مہریں لگائی گئیں ۔ پھر اس کے بعد یہی مضمون چند سطروں میں کربلا ، نجف ، حلہ اور خوارزم کے باشندوں کی طرف سے تھا اس پر انکی مہریں ثبت ہوئیں ۔ مہر لگانے والوں میں سید نصر اللہ بن قطہ اور شیخ جواد نجفی وغیرہ ممتاز افراد تھے ۔

پھر اس کے تحت میں چند سطریں علماء افغانستان کی طرف سے تھیں کہ ایرانی جب ان باتوں کی پابندی کریں گے جو اس محضر میں ہیں تو ہم ان کو کافر نہیں سمجھیں گے بلکہ ان کو اپنے بھائی مسلمانوں کا ایک فرقہ تسلیم کرینگے اس کے نیچے ان کے دستخط ہوئے اور ان کی مہریں لگائی گئیں ۔

بعینہ یہی مضمون ترکستانی علما کی طرف سے بھی تھا ۔ انہوں نے بھی اس پر مہریں لگائیں ۔ عنوان پر میں نے اپنی شہادت لکھ کر دستخط کیا اور مہر لگائی ۔

جب یہ تمام کارروائی ختم ہوگئی تو مجمع سے ایک خوشی کا نعرہ بلند ہوا ۔ سنی اور شیعہ سب کے سب فرحناک تھے اور نہایت گرم جوشی سے باہم گلے مل رہے تھے ..... اس کے بعد شاہ کی طرف سے چاندی کی سینیوں میں خدام حلوے اور مٹھائیاں لیے ہوئے آئے اور خالص سونے کے جڑاؤ عطردانوں سے جو مشک وعنبر سے بھرے ہوئے تھے مجمع کی خاطر کی گئی ۔

پھر شاہ نے مجھ کو بلایا اور کہا کہ میں آپ کا اور ساتھ ہی احمد خاں (پاشا) کا شکر گزار ہوں کہ مسلمانوں کو

باہمی تکفیر اور خونریزی سے بچانے میں سعی فرمائی۔ میں از راہ شکر نہ کہ از راہ فخر یہ کہتا ہوں کہ اس کام کو اللہ نے میرے ہاتھ سے کرایا کہ صحابۂ کرام پر تبرا کرنے سے لوگ تائب ہوئے ورنہ سلاطین عثمانیہ نے کس قدر خونریز جنگیں کیں اور بارہا لشکر لے کر چڑھائی اور لڑائی کرتے رہے مگر یہ سعادت ان کے حصہ میں نہ تھی اور میں نے بلا ایک قطرہ خون بہائے شاہان صفویہ کی اس بدعت قبیح پر جو سارے ملک پر چھائی ہوئی تھی فتح حاصل کر لی۔

میں نے کہا کہ انشاء اللہ سارا ایران جیسے پہلے سنی تھا اب پھر ہو جائے گا۔ شاہ نے کہا رفتہ رفتہ۔ اس کے بعد سر اٹھا کر بولا کہ میں اگر فخر کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ میری ذات اس وقت مجموعہ ہے چار عظیم الشان سلاطین کا یعنی ہندوستان۔ افغانستان۔ توران اور ایران۔ کیوں کہ ان چاروں ممالک کی زمام حکومت میرے ہاتھ میں ہے لیکن رفع تبرا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ تائید الٰہی سے یہ امر حاصل ہوا ہے اور چونکہ میں ذریعہ ہوں۔ اس لیے تمام عالم اسلامی کی یہ خدمت مجھ سے ہوئی ہے۔ مجھے امید ہے کہ صحابۂ کرام میرے اس فعل سے خوش ہونگے اور آخرت میں میری شفاعت کرینگے۔

اس کے بعد مجھ سے کہا کہ تم ابھی ٹھہر جاؤ۔ کل جمعہ ہے اور میں نے حکم دیا ہے کہ جامع کوفہ میں جمعہ پڑھا جائے اور منبر پر حسب ترتیب خلفا کا نام لیا جائے آخر میں خلیفہ عثمانی کے لیے دعا کی جائے اس کے بعد میرے لیے کیوں کہ میں ان کو اپنا بڑا اور بزرگ بھائی سمجھتا ہوں۔ ان کے باپ دادا پشتہا پشت سے اسلام کی خدمت کرتے چلے آئے ہیں اور تم جانتے ہو کہ میں جب دنیا میں آیا تو میرا باپ سلطان نہ تھا۔

میں دربار سے واپس آیا دیکھا کہ ہر ہر خیمہ میں ایرانی بیٹھے ہوئے اسی میثاق کا تذکرہ کر رہے ہیں اور اصحاب ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے فضائل آیات و احادیث سے نکالتے اور شاہان صفویہ کی اس رسم تبرا پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔

دوسرے دن اعتماد الدولہ ظہر کے وقت مجھے لینے کے لیے آیا کہ چل کر جمعہ میں شرکت کردوں میں نے کہا کہ جامع کوفہ میں حنفیہ کے نزدیک بھی جمعہ نہیں ہو سکتا کیونکہ آبادی نہیں ہے اور شافعیہ کے نزدیک بھی کیوں کہ باشندوں کی تعداد چالیس تک نہیں پہنچتی۔ اس نے کہا کہ آپ جمعہ نہ پڑھیں وہاں تو صرف آپ کی موجودگی درکار ہے۔ چنانچہ میں گیا۔ جماعت میں امرا رخوانین۔ علما اور عوام تقریباً پانچ ہزار تھے۔ منبر پر شاہی امام تھا اس نے

خطبہ میں خلفا کا حسب ترتیب نام لیا اور ان کی مدح کی پھر خلیفہ عثمانی اس کے بعد نادر شاہ کے لیے دعا مانگی اور امامیہ کے قاعدہ کے مطابق نماز پڑھائی۔ شام کے وقت شاہ نے مجھے واپسی کی اجازت دی۔ اور میں بغداد کو روانہ ہو گیا۔

صاحب جہاں کشائے نادری نے لکھا ہے کہ نادر شاہ نے مرزا محمد علی نائب وزیر کو روانہ کیا کہ وہ تمام ایران میں دورہ کر کے خطبوں میں خلفائے اربعہ کا نام داخل کریں اور سارے ملک میں اس محضر کی اشاعت کر کے تعمیل کرائیں۔

باب عالی میں بھی یہ ساری کیفیت لکھ کر درخواست کی کہ اب خلیفہ کو اس کے پانچوں مطالبات منظور کر لینے چاہئیں۔

ایک مدت تک سفیروں کی آمد و رفت ہوتی رہی مگر ترکی کے شیخ الاسلام اور سلطان محمود خاں نے اس کی دو باتوں سے انکار کر دیا یعنی نہ مذہب جعفری کی صحت تسلیم کی نہ کعبہ میں پانچواں مصلّٰے منظور کیا۔ باقی تین مطالبات تسلیم کر لیے۔

نادر شاہ بھی مصلحت وقت دیکھ کر ان دو امور کے مطالبہ سے دست بردار ہو گیا۔ بالآخر محرم ۱۱۷۰ھ میں فریقین میں عہد مصالحت لکھا گیا جس پر سلطان کی طرف سے لطیف آفندی عثمانی سفیر نے دستخط کیے۔

تنقید و تبصرہ

فرہنگ عامرہ

زبان اردو کی ترویج کے راستہ میں ایک مشکل یہ بھی درپیش ہے کہ ہمارا نوجوان تعلیمیافتہ طبقہ عربی اور فارسی سے ناآشنا ہوتا جارہا ہے جس کی وجہ سے اُردو کا اندازِ تحریر جو آج سے بیس پچیس برس اُدھر سلیس اور آسان سمجھا جاتا تھا اب مشکل اور مغلق تصور کیا جاتا ہے۔ لکھنے والوں کی دشواری یہ ہے کہ بلند خیالات کا اظہار مجلسی زبان میں مشکل ہی نہیں بلکہ بعض اوقات ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس مشکل کا حل یہی ہوسکتا ہے کہ پڑھنے والے حضرات اخذ مطالب میں کسی لغت کی مدد حاصل کریں۔ لیکن مشکل در مشکل یہ ہے کہ ہمارے ہاں فارسی کے لغت بہت پرانے انداز کے حامل ہیں اور اُردو میں کوئی ایسا لغت ملتا نہیں تھا جو جدید اصول کے مطابق مرتب کیا گیا ہو، اس باب میں مولوی محمد عبداللہ خاں صاحب خویشگی شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے برسوں کی محنت شاقہ کے بعد عربی فارسی۔ ترکی کے قریب چالیس ہزار ایسے الفاظ کا لغت مُرتب کیا ہے جو ہماری زبان میں مستعمل ہیں۔ ہماری قدیم لغت کی کتابوں میں تلفظ کی تشریح کے لیے عام طور پر تائے مکسور۔ یائے مجہول۔ واؤ معدولہ۔ الف مقصورہ" کے قسم کے الفاظ استعمال ہوئے تھے جو بجائے خویش کے محتاج ہوتے تھے اور پھر صحیح تلفظ کے سمجھنے میں دقت بھی باقی رہتی تھی۔ لیکن فرہنگ عامرہ میں تلفظ کی تشریح کے لیے انگریزی ڈکشنریوں کا طرزِ بیان بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ مثلاً "جُدول" کے سامنے لکھا ہے (جَدْوَل) وغیرہ یہ اس فرہنگ کی بڑی خوبی ہے۔ معانی مختصر دیئے ہیں۔ لیکن تفہیم مطالب کے لیے کافی ہیں البتہ اصطلاحات کے معانی بیان کرنے میں مزید تشریح کی ضرورت تھی۔ مثلاً "اشتراکیت" کے معنی لکھے ہیں "جمہوریت پسندی"۔ یہ معنی اس اشتراکیت کا صحیح مفہوم سامنے نہیں

لاتے جو دورِ حاضرہ میں ایک سیاسی عقیدہ میں رائج ہے۔ بایں ہمہ یہ فرہنگ ہماری موجودہ ضروریات کو بڑی حد تک پورا کرے گا۔ جی چاہتا تھا کہ ایسی مفید کتاب ذرا اچھے کاغذ پر چھپتی اور کتابت بھی قدرے صاف ہوتی۔ کتاب مجلد ہے اور چھوٹے سائز کے قریب چھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اس کی قیمت دو روپے کچھ بھی زیادہ نہیں۔ قارئین طلوع اسلام میں سے وہ حضرات جو رسالہ کے انداز تحریر کی مشکل پسندی کی شکایت کیا کرتے ہیں اس فرہنگ سے ضرور فائدہ حاصل کریں۔ ہمیں حیرت ہے کہ وہ خورجہ (یو۔پی) جو باہر کی دنیا میں صرف "چارشلغم" کی وجہ سے معروف ہے وہاں جناب خوشگی جیسی ہستیاں بھی موجود ہیں۔ کتاب جناب مؤلف سے "فیروز منزل متصل جامع مسجد" کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

کانگریس بے نقاب

ہم شروع سے لکھتے چلے آرہے ہیں کہ :-

(i) متحدہ قومیت کی تشکیل کے لیئے ضروری ہے کہ وہ دو یا دو سے زیادہ مختلف قومیں جو اِس متحدہ قومیت کے عناصرِ ترکیبی ہوں۔ ایک دوسرے میں اس طرح مدغم ہو جائیں کہ انمیں کوئی وجہِ امتیاز باقی نہ رہے۔ ان کی تہذیب، تمدن نظریاتِ زندگی فلسفۂ حیات۔ زاویائے نگاہ بایں نمط ایک ہو جائیں کہ :-

"تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری"

(ii) چونکہ مسلمان دُنیا میں ایک مستقل اور مخصوص نظریۂ زندگی اور فلسفۂ حیات کے قائل ہیں۔ جسے ضابطہ خداوندی کہا جاتا ہے اور جو اُن کی تہذیب اور تمدن کا سرچشمہ ہے اِسلیئے وہ بجائے خویش ایک مستقل قوم (حزب اللہ) ہیں، لہذا نہ تو مسلمان کسی متحدہ قومیت کا جزو بن سکتے ہیں۔ اور نہ ہی کوئی غیر مسلم اُن کی جماعت کا رُکن بن سکتا ہے، تا وقتیکہ وہ اِسلام لاکر اُن میں کا ایک نہ ہو جائے۔

اَور

(iii) موجودہ تحریکِ آزادی سے ہندوؤں کا مقصد محض اتنا ہے کہ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کی ان ملّی خصوصیات کو مٹا کر مُلک میں "رام راج" قائم کر لیا جائے۔ اپنے اِن دعاوی کے ثبوت میں ہم بارہا ہندو کانگرسی زعماء کی تقریروں اور تحریروں کے اقتباسات اِن صفحات پر پیش کر چکے ہیں۔ جن میں یہ حقیقت چھلک کر سطح پر آجاتی رہی ہے۔ لیکن ہمارے مسلمان قومیت پرست

حضرات اکثر یہ کہہ کر اپنے آپ کو اور دوسروں کو دھوکے میں رکھنے کی کوشش کرتے رہے، کہ یہ خواہ مخواہ کی بدگمانی ہے۔ چونکہ ہمارے دعاوی اس فراست قرآنی پر مبنی تھے جو ایک مسلمان کے لیے دُنیا کے ہر گوشہ میں بہترین راہ نما ہو سکتی ہے اس لیے ہمیں یقین تھا کہ حالات خود بخود بتا دینگے کہ ہمارا مسلک بدگمانی پر مبنی ہے یا حقیقت پر۔ الحمد للہ کہ اس باب میں ہمیں زیادہ دیر تک زحمت کشِ انتظار نہیں ہونا پڑا۔ اور واقعات اس تیزی سے بڑھتے آرہے ہیں کہ جنسے یہ حقیقت خود بخود بے نقاب ہوتی جارہی ہے اور قومیت پرست حضرات میں سے اکثر و بیشتر اتنا محسوس کرنے لگ گئے ہیں کہ تحریکِ آزادی کی "نیلم پری" محض ایک دھوکا ہے جس کی آڑ میں ہندو راج کے منصوبے پرورش پا رہے ہیں۔ ذیل میں ہم آچاریہ کرپلانی۔ جنرل سکریٹری آل انڈیا کانگرس کمیٹی۔ کا ایک مبسوط بیان شائع کرتے ہیں جس سے معلوم ہو جائے گا کہ موجودہ تحریکِ آزادی سے کانگریس کا مفہوم کیا ہے۔ اس بیان پر ہم اپنی طرف سے کوئی تنقید نہیں کرینگے۔ بلکہ اسکے بعد ایک ایسے اخبار کا تبصرہ من وعن شائع کر دیں گے، جو اپنے مسلکِ قومیت پرستی میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ اس بیان اور تبصرہ کے مطالعہ کے بعد خود اس نتیجہ پر پہونچ جائینگے کہ ہمارے مسلم قومیت پرست حضرات تحریکِ آزادی کے فریب میں قوم کو تباہی اور بربادی کے کس جہنم کی طرف کشاں کشاں لئے جارہے ہیں۔

بیان آچاریہ کرپلانی

گاندھی جی نے زندگی کا کوئی ایسا فلسفیانہ نظام پیش نہیں کیا ہے جو منطقی حیثیت سے مکمل ہو لیکن پھر بھی انھوں نے سیاست و معاشرت کا جو خاکہ تیار کیا ہے اسکے تمام اجزا ایک دوسرے کے ساتھ جُڑے ہوئے ہیں۔ اِن تمام اجزا کا بُنیادی اُصول ایک ہی ہے۔ اور ان سب میں زبردست اتحاد پایا جاتا ہے۔ ان اجزا کو نہ تو بنیادی اُصولوں سے جُدا کیا جا سکتا ہے

اور نہ باہم ایک دوسرے سے اُنکا جو تعلق ہے اُسے توڑا جا سکتا ہے۔ اور اگر ایسا کیا جائیگا تو سارا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ اگر ہم گاندھی جی کے بتلائے ہوئے بُنیادی اُصولوں کو نہ مانیں تو پھر ہمارے کام کا سارا پروگرام بے رُوح ہو کر رہ جائے گا۔ علی ہذا القیاس اگر ہم اُصول کو تو مانیں۔ لیکن اُس کے ساتھ جو پروگرام وابستہ ہے اُسکے مختلف اجزاء کے باہمی ربط کو نہ مانیں تب بھی ہم پروگرام کی اہمیت کو زائل کر دینگے اِس لیئے وہ لوگ جو کانگرس کے پروگرام کو تو مانتے ہیں۔ لیکن اُس سیاسی عقیدہ کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں جس پر گاندھی جی نے کانگرس کے پروگرام کی بُنیادیں قائم کر رکھی ہیں، وہ درحقیقت نہ تو کانگریس کی حالیہ تاریخی ترقی سے واقف ہیں۔ اور نہ یہ جانتے ہیں کہ گاندھی جی کے فلسفۂ حیات (آئڈیالوجی) نے کانگریس میں کیا مرتبہ حاصل کر لیا ہے۔ ایسے لوگوں کو معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ اب کانگرس صرف ایک ایسی سیاسی جماعت ہی نہیں ہے جو مُلک کو پردیسی اقتدار سے آزاد کرنا چاہتی ہے۔ بلکہ یہ ہماری معاشرت کی موجودہ حیثیت کو بھی بالکل بدل ڈالنا چاہتی ہے اور اس کی بنیاد ایک بالکل نئے فلسفہ پر رکھنا چاہتی ہے، جب تک گاندھی جی کا اثر کانگرس پر غالب نہیں ہوا تھا۔ اُسوقت تک کانگرس کے لیڈروں کا خیال یہ تھا کہ کانگرس کو صرف سیاست کے دائرہ میں محدود رکھنا چاہیئے۔ اُن لوگوں کا خیال تھا کہ ہماری سیاسی غُلامی کو ہماری معاشرتی حالت سے براہِ راست کوئی بُنیادی تعلق نہیں ہے۔ اِسی لیئے اِن لیڈروں نے یہ طے کیا تھا کہ کانگرس کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ معاشرتی اصلاح کے کاموں میں دخل دے۔ وہ اسے بالکل سیاسی جماعت رکھنا چاہتے تھے۔ اُس زمانہ میں یہ ممکن تھا کہ مختلف معاشرتی نظریہ رکھنے والے انسان سیاسی حیثیت سے ایک محاذ پر جمع ہو جائیں۔ گویا ان لوگوں نے زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا:۔ ایک سیاسی زندگی اور دوسری معاشرتی زندگی ـــــ لیکن گاندھی جی نے آکر اس اصول کو توڑ دیا۔ اُنھوں نے پُرانے ڈاکٹروں کی تشخیص کو غلط قرار دے کر یہ بتلایا کہ ہماری سیاسی غلامی کوئی ایسی چیز نہیں ہے، جسے ہم اپنی اخلاقی، رُوحانی، اور

معاشرتی زندگی سے جُدا کرسکیں، اس لیئے ہماری سیاسی جدوجہد کو معاشرتی، اخلاقی اور رُوحانی جدوجہد کے ساتھ وابستہ ہونے کی سخت ضرورت ہے۔

گاندھی جی نے کانگرس کو یہ بتلایا کہ ہمارا کام صرف یہی نہیں ہے کہ مُلک کی سیاسی باگ ڈور انگریزوں کے ہاتھ سے چھین کراہلِ ملک کے ہاتھ میں دیدیں، بلکہ سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ ہم اپنی تمام جدوجہد کی بُنیاد کسی ایسے فلسفۂ زندگی پر رکھیں جس کے دائرہ میں ہماری معاشرت، اخلاق اور رُوحانیت سب کچھ داخل ہو، بالفاظ دیگر، ہماری تحریک کو صرف سیاسی ہی نہ ہونا چاہیئے بلکہ اُسے رُوحانی اور اعلیٰ فلسفہ زندگی کے ماتحت ہونا چاہیئے تاکہ اس جدوجہد سے نہ صرف ہماری سیاسی زندگی ہی مُتاثر ہو، بلکہ ہماری زندگی کا ہر شعبہ اس سے متاثر ومتغیر ہو اور ہماری زندگی کا ایک بالکل نیا باب شروع ہو جسے ہم تاریخ کا ایک نیا دَور کہہ سکیں۔

زندگی کا یہی وہ نیا باب اور نیا دَور ہے جسے گاندھی جی کانگریس کے ذریعہ ہندوستان میں لانے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ اِس میں بڑی دقتیں ہیں۔ لیکن ان تمام دقتوں کے باوجود گاندھی جی کی کوشش ہمیشہ یہ رہی ہے کہ اس جامع انقلاب کو کانگرس کے ذریعہ رونما کیا جائے۔

اس انقلاب کی اہمیت کو سمجھ لینے کے بعد یہ بالکل ناممکن ہے کہ ہم گاندھی جی کے بتلائے ہوئے عقیدہ ——— یعنی عدم تشدد اور صداقت یا اہنسا اور ستیہ ——— کو تو نہ مانیں لیکن کانگریس کے پروگرام کو قابلِ عمل سمجھیں، اسلیئے کہ یہ عقیدہ اور پروگرام دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح جکڑے ہوئے ہیں جس طرح جانور کی ٹانگ اُسکے جسم کے ساتھ یا درخت کی شاخیں اس کی جڑ کے ساتھ۔ اگر آپ جڑ کو کاٹ دینگے تو شاخیں کہاں رہینگی؟ جس چیز کو آپ پروگرام کہتے ہیں وہ دراصل اِسی عقیدہ ہی سے تو نکلا ہے۔

ہم سے اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ چرخہ، کھادی، دیہات سدھار، اور اچھوت ادھار کو سیاسی

انقلاب سے کیا تعلق۔ لیکن اگر ہم مذکورۂ بالا اُمور کو پیشِ نظر رکھیں تو پھر یہ سوال نہیں کرینگے۔ کانگرس کے لیئے یہ ناممکن ہے کہ سیاسی لحاظ سے اس کی رائے کچھ اور ہو، اور معاشرتی اعتبار سے کچھ اور، سیاست و معاشرت دونوں کے متعلق کانگرس کا نقطۂ نظر ایک ہونا چاہیئے۔

ستیہ اور اہنسا یا صداقت و عدم تشدد ایک قسم کی مذہبی اصطلاحیں ہیں۔ لیکن ہمیں ان اصطلاحوں کو قوم کی زندگی کے ہر شعبہ میں بروئے عمل لانا ہے، رُوحانی اصول زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہوتے ہیں، انہیں زندگی کے کسی ایک پہلو سے متعلق کرکے باقی پہلوؤں کو اُن سے بے نیاز کرنا ناممکن ہے۔ خلاصہ یہ کہ گاندھی جی نے ہماری زندگی کے عملی کام کا جو پروگرام پیش کیا ہے، ہمیں صرف اسی کو چلانا ہوگا۔

ان باتوں کو سمجھ لینے کے بعد ہندو مسلم اتحاد کے سوال کو سمجھ لینا بے حد آسان ہے، گاندھی جی نے ہمیں یہ سمجھایا ہے کہ اس سوال کو حل کرنے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ ہم مسلمانوں کو رعایتیں، نشستیں اور سیاسی حقوق دیدیں یا مُسلم عوام کے ساتھ براہِ راست رابطہ پیدا کرنے کی اسکیمیں چلاکر کانگریس کے رجسٹر میں مسلم ممبروں کی تعداد بڑھالیں۔

گاندھی جی جس رابطۂ عوام کو چاہتے ہیں وہ اِس طرح حاصل نہیں ہوسکتا۔ اسکا ذریعہ صرف یہ ہے کہ صداقت و انصاف کے ساتھ نہ کہ لین دین کے محض سیاسی جذبہ کے ساتھ اکثریت رکھنے والا فرقہ ہر ساعت اقلیت والے فرقہ کی خدمت کرے۔ ہندو مسلمانوں کے درمیان نفرت و بداعتمادی کے بہت قدیم اور تاریخی اسباب ہیں۔ ان اسباب کو نہ تو رعایتوں اور معاہدوں سے دُور کیا جاسکتا ہے اور نہ مُسلمانوں کو کانگرس کا ممبر بناکر ہی اُن کو رفع کردینا ممکن ہے۔ اگر نفرت و بداعتمادی کے ان اسباب کو رفع کیئے بغیر مسلمانوں کو کانگرس کا ممبر بنالیا جائے، تو وہ کانگرس کے اندر ایک لاینحل مسئلہ بن جائینگے۔ لیکن مسلمانوں کا کانگرس کے باہر رہ کر

ایک لاینحل مسئلہ بنا رہنا اتنا بُرا نہیں ہے جتنا بُرا یہ ہے کہ وہ کانگرس میں آکر کانگرس کے اندر عقدۂ لاینحل بن جائیں۔ اِس لیئے گاندھی جی نے ہندو مسلم اتحاد کا جو طریقہ اختیار کر رکھا ہے وہی سب سے بہتر طریقہ ہے۔ جو اُنکے بنیادی اُصول یعنی عدم تشدّد اور صداقت پر مبنی ہے۔

بہرحال اسوقت تک ہم نے جو کچھ کہا ہے اُس سے یہ بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے کہ کانگرس کے عقیدہ اور پروگرام میں باہم گہرا تعلق ہے۔ نیز اسکے تمام مختلف پروگرام بھی ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح جڑے ہوئے ہیں جیسے جسم کے ساتھ اعضائے جسم۔ اِس لیئے کسی ایک پروگرام کو دوسرے پروگرام سے جُدا کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی ذی رُوح جسم کے اعضاء کو چیر پھاڑ کر کے جُدا جُدا کرنا۔

عقیدہ اور پروگرام کا یہ اتحاد ہی دراصل گاندھی جی کے فلسفۂ حیات کا دوسرا نام ہے۔ یہ فلسفہ اپنی صفات کے لحاظ سے انقلابی ہے۔ لیکن اِس انقلاب میں تشدد کا ذکر کہیں نہیں آتا۔ اس انقلاب کی اصل حقیقت یہ ہے کہ ہم زندگی کو دیکھنے کا نیا نقطۂ نظر پیدا کریں۔ اور ہر چیز پر ایک بالکل نئی حیثیت سے نظر ڈالیں یا ایک رُوحانیت پرست کی زبان میں یوں کہیئے کہ ہم چیزوں کی ابدی و سرمدی حقیقت کو معلوم کریں اور پھر اپنی زندگی کو اسکے مطابق ڈھالیں۔

لیکن تمام اُصول اور پروگرام بیکار رہیں تا وقتیکہ انکو چلانے والی عملی شخصیت موجود نہو یہ شخصیت دراصل غیر محسوس اصولوں اور پروگراموں کا محسوس مجسمہ ہوتی ہے۔ آج کل اِس قسم کی شخصیت صرف گاندھی جی کی شخصیت ہے اسلیئے اگرچہ اُن کی بعض اسکیمیں بظاہر موجودہ زمانہ کے لحاظ سے نامناسب نظر آئیں لیکن پھر بھی ان میں عجیب و غریب طاقت ہوتی ہے۔ گاندھی جی کا فلسفہ ایک مکمل انقلابی فلسفہ ہے جو حقیقتوں اور سچائیوں پر مبنی ہے وہ ہماری ساری زندگی کو ایک بالکل نئے سانچے میں ڈھال دینا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہی گاندھی جو ایک زمانہ میں کونسلوں میں جانے کا شدید مخالف تھا۔ اب نہ صرف کونسلوں میں جانیکا حامی ہے۔ بلکہ عہدے قبول کرنے کے حق میں بھی ہے۔ اور پھر اس کی پھرتی ملاحظہ کیجیے کہ جیسے ہی کانگریسیوں نے وزارت کی کرسیاں سنبھالیں۔ اُس نے فوراً ہی اسکیمیں پیش کرنا

شروع کردیں ——— شراب کی بندش کی اسکیم، تعلیم کی ایک بالکل نئی اسکیم۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیئے کہ کانگرس کی ہر اسکیم گاندھی جی کے فلسفہ کے ماتحت چلائی جائیگی۔ یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ آپ کسی اسکیم کو کسی اور فلسفہ زندگی کے اُصول پر چلائیں کانگرسی اسکیموں کا قلم کسی اور فلسفہ پر نہیں لگایا جا سکتا یہ فلسفہ زندگی دُنیا کے کسی اور فلسفہ زندگی کا ماتحت نہیں بنایا جا سکتا۔ علیٰ ہذا القیاس سوشلسٹوں کو بھی یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ سوشلزم اور گاندھی ازم بالکل جُدا جُدا چیزیں ہیں جن میں کوئی مطابقت پیدا نہیں کی جا سکتی۔

بہر حال گاندھی جی کا فلسفہ زندگی ایک ایسا مکمل فلسفہ ہے۔ جس سے اجتماعاً قوم بھی صحیح رہبری حاصل کر سکتی ہے اور فرداً فرداً اشخاص بھی اس سے سیدھا راستہ پا سکتے ہیں اُصول اور پروگرام دونوں ایک ہی ہیں۔ اِس لیئے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم کانگرس کے فلاں پروگرام کو تو مانتے ہیں۔ لیکن اُس کے فلاں اُصول کو نہیں مانتے، کیونکہ گاندھی جی کے اصول و پروگرام میں وہی رُوح جسم کے مختلف اعضا کا سا تعلق ہے۔ یہ دونوں ایک ہی چیزیں ہیں اور دونوں ملکر قوم سے ایک خاص نوع کی زندگی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اسی مطالبہ کی روشنی میں تعلیم کا نیا نظام ترتیب دیا گیا ہے۔ چرخہ، کھادی، دیہات سُدھار، اچھوت اُدھار، ہندو مسلم اتحاد وغیرہ وغیرہ سب ایک ہی اصول کے ماتحت ہیں۔ اور جب تک اس اصول کو نہ سمجھا جائے ان چیزوں کی اصلیت، نیز ان سب کے باہمی ربط کو سمجھنا مشکل ہے۔ اِس ایک ہی اصول کے پیشِ نظر گاندھی جی نے تعلیم کی ایک نئی اسکیم تیار کی ہے۔ اِس تعلیم کے ذریعہ بچوں کو گاندھی جی کی نئی سوسائٹی میں اپنی جگہ پیدا کرنے کے لیئے تربیت کیا جائے گا۔ اِس نئی سوسائٹی کی ضروریات کے مطابق بچوں کی ذہنیت کو ڈھالا جائے گا۔ بنا بریں تعلیم کی اسکیم کو گاندھی کے سیاسی معاشرتی پروگرام کا سنگِ بنیاد سمجھنا چاہیئے"۔

مقالہ افتتاحیہ صفحہ ۴ پر آچاریہ کرپلانی جنرل سکریٹری آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا جو مضمون شائع کیا جارہا ہے، وہ کانگرس کے تقریباً ۹۵ فیصدی ممبروں کے نقطۂ نظر کی صحیح ترجمانی کرتا ہے اِس مضمون میں جو کچھ کہا گیا ہے اُسکا خلاصہ یہ ہے کہ :-

(۱) آج سے پہلے کانگرس صرف ایک سیاسی جماعت سمجھی جاتی تھی۔ مگر جب سے گاندھی جی کا اثر اسپر غالب ہوا ہے۔ یہ صرف سیاسی جماعت نہیں رہی، بلکہ اُسکا دائرہ عملِ اخلاق، معاشرت اور روحانیات سب پر حاوی ہوگیا ہے۔ اب کانگرس، گاندھی جی کی رہنمائی میں ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں ایک انقلاب بپا کردینا چاہتی ہے۔

(۲) یہ انقلاب ہماری زندگی کو بالکل اُسی طرح بدل دیگا۔ جس طرح فرانس اور روس کے انقلاب نے وہاں کی ہر چیز کی قدر و قیمت اور ہر رسم و رواج کی نوعیت و حیثیت کو یکسر متغیر کرکے رکھ دیا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کانگرس اس انقلاب کو تشدّد سے نہیں، عدم تشدد سے لانا چاہتی ہے

(۳) گاندھی جی ہم کو ایک نئی زندگی اور ایک نئی سوسائٹی سے رُوشناس کرنا چاہتے ہیں اور اِس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے مختلف موانع کے باوجود انھوں نے کانگریس کو منتخب کیا ہے۔

(۴) اِس انقلاب کا عملی نمونہ وہی ہے جو ہمیں گاندھی جی کی زندگی میں نظر آتا ہے۔

(۵) کانگرس کے ہر ممبر کے لیئے ضروری ہے کہ وہ گاندھی جی کے فلسفۂ زندگی کو دنیا کے تمام دوسرے فلسفہ ہائے زندگی سے بہتر سمجھے۔ اور کانگرس کے پروگرام کو گاندھی جی کے فلسفہ کی روشنی میں دیکھے۔ جو شخص ایسا نہیں کرسکتا وہ کانگرس کا ممبر نہیں بن سکتا۔

(۶) گاندھی جی کے فلسفۂ زندگی اور اُنکے عملی پروگرام میں ایک ذی روح جسم کے مختلف اعضا کا سا تعلق ہے۔ اس لیئے یہ ناممکن ہے کہ آپ صرف پروگرام کو مانیں اور اصول کو نہ مانیں یا ان میں سے کسی ایک جزو کو مانیں اور دوسرے کو نہ مانیں۔ بہ الفاظِ دیگر:- جو شخص گاندھی جی کے فلسفۂ زندگی کو نہیں مانتا، یعنی سیاست، معاشرت اور اخلاق و روحانیات وغیرہ کے متعلق انکا جو نقطۂ نگاہ ہے۔ اُس کی نظری یا عملی کسی شکل کو بھی کُلاً یا جزءً صحیح تسلیم نہیں

کرتا، وہ سچا کانگرسی نہیں بن سکتا ۔

(۷) علیٰ ہذا القیاس وہ لوگ بھی سچے کانگرسی نہیں ہیں جو صرف سیاسی آزادی کے مقصد میں کانگرس سے متحد ہیں۔ لیکن تمدنی، معاشرتی، اخلاقی اور رُوحانی نظریوں میں گاندھی جی سے اختلاف رکھتے ہیں ۔

(۸) ہم نہیں چاہتے کہ جب تک مسلمان ان باتوں کو نہ مانیں کانگرس میں داخل ہوں اسلیئے کہ ابتک تو وہ کانگرس کے باہر ہمارے لیئے مصیبت بنے ہوئے ہیں۔ لیکن اگر اپنے موجودہ عقائد ہی کے ساتھ وہ کانگریس میں داخل ہوگئے تو پھر کانگریس کے اندر ہمارے لیئے اس سے کہیں زیادہ مصیبت بنجائیں گے ۔

(۹) گاندھی جی نے وزارتیں قبول کرنے کا مشورہ صرف اسلیئے دیا ہے تاکہ اپنے نقطۂ نظر کے مطابق وہ ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں انقلاب بپا کرسکیں، تعلیم کی جدید اسکیم اس انقلاب کا پہلا دروازہ ہے۔ اس اسکیم کے ذریعہ نئی نسل کی ذہنی تربیت گاندھی جی کے فلسفۂ زندگی کے مطابق کی جائیگی ۔

اتحاد کے بجائے ادغام

یہ تمام باتیں مسلمانوں کے لیئے قابل قبول ہوں یا نہ ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ آجکل قومی اتحاد و یکرنگی کا جو نظریہ ہے اس کی رُو سے ان کو غلط نہیں کہا جا سکتا۔ آپ نیشنلزم کے قائل ہوں یا سوشلزم کے، دونوں صورتوں میں آپ کا یہ عقیدہ ہونا چاہیئے کہ ہندوستان کے تمام فرقوں کے فلسفۂ زندگی کی کم از کم بنیاد ایک ہو گاندھی جی یہی چاہتے ہیں، اور چونکہ وہ ہندو ہیں اور ہندو بھی نہایت پُرجوش و راسخ العقیدہ قسم کے، اسلیئے قدرتًا اُن کی یہ خواہش ہے کہ اس فلسفہ زندگی کی بنیاد ہندو فلسفہ، ہندو تاریخ۔ اور ہندو روایات پر ہو، اُردو کے مقابلہ میں ہندی کو فروغ دینے کی جو دیوانہ وار کوششیں اُنھوں نے کیں اور کر رہے ہیں وہ اسی خواہش کا نتیجہ ہیں۔ اچھوتوں کو ہندوؤں میں شامل کرنے کے لیئے اُنھوں نے اپنی جان پر کھیل جانیکی جو دہمکی دی تھی اس کی تہ میں بھی صرف یہی تمنا کام کر رہی تھی اور اب ودیا مندر اسکیم اور واردھا

اسکیم کے نام سے تعلیم کی جو اسکیمیں تیار کی گئی ہیں۔ ان میں بھی یہی آرزو چھپی ہوئی ہے۔

لیکن ہم اس آرزو کو کسی بدنیتی، خباثت، یا شرارت پسندی پر محمول نہیں کر سکتے۔ گاندھی جی ایمانداری سے جس چیز کو صحیح سمجھتے ہیں، اُسے رائج کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیئے اس سلسلہ میں گاندھی جی کو بُرا بھلا کہنا صحیح نہیں ہوسکتا۔ البتہ ہم کو یہ غور کرنا چاہیئے کہ اِن حالات میں مسلمانوں کا سیاسی رویہ کیا ہونا چاہیئے۔ یعنی آیا وہ ہندوستان کے دوسرے فرقوں کے ساتھ اس طرح مل جُل جانا چاہتے ہیں کہ یہاں جاپان و جرمنی کی طرح ایک قوم پیدا ہو جائے یا وہ اپنی تہذیبی اور معاشرتی خصوصیتوں کو باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ بالفاظ دیگر: آیا آپ ہندؤں کے ساتھ اتحاد واشتراک چاہتے ہیں یا ادغام وانضمام کا۔

کچھ دن ہوئے، راقم الحروف نے اِن خطرات کو حضرت مولانا ابو الکلام آزاد کی خدمت میں پیش کر کے اُن سے دریافت کیا تھا کہ:۔

مسلمان کانگرس میں صرف حصولِ آزادی کے مقصد میں ہندؤں کے ساتھ اشتراک کرنے کے لیئے داخل ہوئے ہیں، وہ نیشنلزم یا سوشلزم کے یورپی نظریوں کے قائل ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ لیکن آج نیشنلزم یا سوشلزم کا کھلا ہوا پرچار ہو رہا ہے، جس سے عام دماغ قدرتاً متاثر ہوتے ہیں، ایسی صورت میں مسلمانوں کا طرزِ عمل کیا ہو۔ آیا وہ کانگرس میں رہ کر اِس قسم کے خیالات کی تردید کریں یا اُن پر سکوت اختیار کریں لیکن تردید کرنا بے سود ہے۔ اور سکوت کرنا مضر، پھر علاج کیا ہو ــــ ؟

اس پر مولانا نے ارشاد فرمایا تھا کہ:۔

"دفاعی قومیت اسلام کے منافی نہیں، البتہ ہجومی (جارحانہ) قومیت اسلام کے منافی ہے، مگر اسوقت ہماری جدوجہد میں سوال ہجومی قومیت کا نہیں بلکہ دفاعی قومیت کا ہے۔ یعنی اسوقت ہمارے سامنے ہندوستان کو غاصبوں کے چنگل

سے نجات دلانے کا سوال ہے سو اس امر میں مسلمان کو ہندوؤں کے ساتھ ایک قوم بنکر دفاع کی کوشش سے پرہیز نہ کرنا چاہیئے۔ اس قسم کی قومیت اسلامی توسع کے خلاف نہیں۔ مسلمان کو صاف طور سے یہ اعلان کر دینا چاہیئے۔ اور اس اعلان کو ہر در و دیوار پر نقش کر دینا چاہیئے۔ کہ وہ ہندویت میں جذب ہونے کے لیئے ایک لمحہ کے واسطے بھی تیار نہیں۔ بحیثیت مسلمان کے اُن کی جو تہذیبی خصوصیات ہیں ان کو وہ نہ صرف باقی رکھیں گے، بلکہ اُن کو ترقی دینگے۔ کانگریس میں شریک ہونے اور ملک کی آزادی کی جد و جہد میں حصہ لینے کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ مسلمان اپنی کسی ایک ملّی خصوصیت کو بھی چھوڑ دیں"۔

لیکن کرپلانی جی کے مذکورۂ بالا اعتراف اور گاندھی جی اور اُنکے پرستاروں کے مسلسل عمل کو دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ مولانا کے اِن خیالات سے بالکل متفق نہیں ہیں۔

مولانا نے یہ بھی فرمایا تھا کہ :-

"ہمیں اسوقت مستقبل کا پورا نقشہ ترتیب نہ دینا چاہیئے، بلکہ صرف راستہ کے پتھر ہٹانے چاہئیں، یہ نہ سوچنا چاہیئے کہ پانی جو آرہا ہے وہ اپنا رُخ کدھر بنائے گا اور کون سا راستہ اختیار کرے گا۔ اس چیز کو مستقبل پر چھوڑ دینا چاہیئے"۔

چنانچہ جو مسلمان کانگریس میں شامل رہے انھوں نے حصولِ آزادی کے سوا باقی اور تمام باتوں کو چھوٹی چھوٹی باتیں سمجھ کر نظر انداز کیا۔ لیکن اُسکا نتیجہ یہ ہوا کہ آزادی کا سوال تو ہنوز ایک اُمید بعید بنا ہوا ہے۔ البتہ زندگی کا نقشہ روز بروز تیار ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اور ہر ہندوستانی کے دماغ پر اس نقشہ کے نقوش منقش کیئے جا رہے ہیں، بالخصوص وزارتوں کے قبول کے بعد تو یہ کام کافی تیزی کے ساتھ جاری ہوگیا ہے۔ اس لیئے اب بھی مسلمانوں کا "صرف راستہ کے پتھر ہٹاتے رہنے" پر اکتفا کرنا اپنی ملّی ہستی کو فنا کے گھاٹ اُتارنے کے مترادف ہوگا۔

ہندو مسلم کشیدگی کا سبب کون ہے ؟

گاندھی جی نے ایبٹ آباد میں ہندو مسلم اتحاد کے مسئلہ پر تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ

"مجھے اپنے باپ کا وہ زمانہ یاد آتا ہے جب راجکوٹ کے ہندو اور مسلمان آپس میں شیر و شکر رہتے تھے اور ایک دوسرے کی خانگی تقریبات اور شادی بیاہ کی رسوم میں حقیقی بھائیوں کی طرح شریک ہوتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ زمانہ پھر آئے گا۔"

لیکن گاندھی جی کتنے ہی بھولے بنیں، وہ اس حقیقت کو جھٹلانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے کہ انکے باپ زمانہ کے خوشگوار دنوں کو بدل کر ہندو مسلم اتحاد کو ہندو مسلم کشیدگی میں تبدیل کرنے کی زبردست ذمہ داری خود گاندھی جی پر عائد ہوتی ہے گاندھی جی نے کوشش کی کہ ہندوؤں کی قدیم معاشرت و تصورات کو زندہ کیا جائے، اور پھر مسلمانوں سے اشتراک کے بجائے ادغام کا مطالبہ کیا جائے گا۔ گاندھی جی کے باپ کے زمانہ میں سیاست و معاشرت کو گڈمڈ کر کے یہ کوشش نہیں کی جاتی تھی کہ ہندو مسلمان سب ایک ہی فلسفۂ زندگی کی اتباع کریں۔ اس زمانہ میں یہ کوشش نہ ہوتی تھی کہ چونکہ اردو میں عربی فارسی کے الفاظ زیادہ ہیں۔ اس لیے اسے چھوڑ کر "ہندی اتھوا ہندوستانی" بولو، نہ اس زمانہ میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ چونکہ فلاں لباس یا فلاں طریق بود و ماند مسلمانوں کا لایا ہوا ہے اسلیئے اسے ترک کرو، اس زمانہ کی کانگرس کے پنڈال میں "بھوجنالہ" کے اندر پتوں پر "رسوئی پروسنے" کی کوشش نہیں ہوتی تھی ——— غرض اس زمانہ میں ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی نہ تھی۔ جو گاندھی جی کے طفیل سے اب پیدا ہو گئی ہیں۔ اور ابھی کیا ہے

شور و شغب کی راتوں کو ہمسائے تمہارے کیا روئیں
ایسے فتنے کتنے اٹھیں گے میر جی تم جو سلامت ہو

کیا ہو؟

سوال یہ ہے کہ ان حالات میں مسلمانوں کا رویہ کیا ہو؟ یہ تو ظاہر ہے کہ مسلمان کانگرس میں اس لیے نہیں گئے ہیں کہ آچاریہ کرپلانی کے بیان کے بموجب گاندھی جی کے فلسفۂ زندگی کو دنیا کے تمام دوسرے فلسفوں پر ترجیح دیکر اس کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنے کی کوشش کریں۔

اُنکا مقصد ہندوں کے ساتھ صرف سیاسی اشتراک ہے لیکن اسوقت مطالبہ ہے، سیاسی معاشرتی اور تہذیبی ادغام کا۔ آج کل کانگرس کی جدوجہد صرف یہی ہے۔ صرف اسی وجہ سے اڑیسہ اور سی پی میں مسلمان وزیر لینے سے انکار کیا گیا۔ اور اسی بنا پر مشترک انتخاب کو رائج کرنیکی کوشش ہے اِسی طرح اور بہت سی باتیں ہو رہی ہیں جنکی بنیاد صرف اس تصور پر ہے کہ مسلمانوں کی جداگانہ تہذیبی حیثیت کو فنا کرکے ہندوستان کی متحدہ قومیت میں انہیں جذب کرلیا جائے اب تک مسلمان ان کوششوں کا مقابلہ کرتے تھے، لیکن اب کانگرس کے آئین کی ترمیم اور ڈسپلن کی سختی کے بعد یہ بھی ممکن نہیں۔ بایں بازو سے مسلمانوں کو کچھ توقع ہوسکتی تھی۔ لیکن اب یہ بھی ممکن نہیں کیونکہ ترمیم شدہ آئین کی رُو سے شہر کے مقابلہ میں دیہات کے نمائندوں کی تعداد بڑھاکر ہمیشہ کے لیئے یا کم ازکم ایک غیر معین مُدّت کے لیئے بایں بازو کو منسوخ کر دیا گیا ہے، سوبھاش چندر بوس کو اخراج کا فرمان مل ہی چکا ہے اور اسی طرح اور جو لوگ گستاخی کے مرتکب ہوں گے انکا کان پکڑکر باہر نکال دیا جائیگا۔ گاندھی جی جو آج کل کانگرس کے آئینی ڈکٹیٹر ہیں اُنکا حال جو کچھ ہے ظاہر ہے۔ پھر کانگرس کو مسلمانوں سے پاک رکھنے کی جو منظم کوششیں کی جارہی ہیں وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ صاف طور پر یہ چاہا جاتا ہے کہ اگر مسلمان کانگرس میں آتے ہیں تو صرف اِس طرح آئیں ——

"جیسے دریوزہ گری کرنے کو گدا آتے ہیں!"

بہت سی بے عنوانیاں صرف اِسی غرض سے کی جاتی ہیں جن میں سے بعض کو تو نادانستہ غلطی کہہ کر تسلیم کرلیا جاتا ہے اور بعض کی تاویل یہ کردی جاتی ہے کہ "کیا کریں، مسلمان آتے نہیں اب ہم لوگوں کو کہاں تک روکیں"

سُبحان اللہ! پہلے تو مسلمانوں کو آنے سے رَوکا جاتا ہے اور جب وہ نہیں آتے تو پھر اُنہیں موردِ عتاب بنایا جاتا ہے۔

پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں ہم وفادار نہیں تو بھی تو دِلدار نہیں

(دوسری قسط۔ مدینہ مورخہ ۸/۳۹ ۲۱)

پچھلے پرچہ میں جو کچھ کہا جا چکا ہے، اُس سے یہ حقیقت بخوبی روشن ہو جاتی ہے کہ اب کانگرس محض ایک سیاسی جماعت نہیں رہی بلکہ اب یہ معاشرتی، اخلاقی اور رُوحانی جماعت بھی ہوگئی ہے۔ اب یہ گاندھی جی کی رہنمائی میں سیاسی انقلاب بپا کرنے کے ساتھ ساتھ ہندوستانی تہذیب و معاشرت اور آداب اخلاق میں بھی ایک انقلاب رُونما کر دینا چاہتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان میں نانگا پربت سے لیکر راس کماری تک ہماری معاشرت تہذیب و تمدّن زبان اور اخلاقی و رُوحانی ضابطہ بُنیادی اور اُصولی طور پر ایک اور صرف ایک ہو۔ اور آج سڑکوں، گلیوں، بازاروں میں ہندو مسلمان کے آداب معاشرت اور آئین اخلاق میں جو امتیاز نظر آتا ہے، وہ یک قلم فنا ہو جائے۔ یہ وہی تصور ہے جسے آج کل کی اصطلاح میں نیشنلزم کہا جاتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مسلمان اِس چیز کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو سکتے ہیں؟ اسکا جواب صاف ہے۔ اُن چند مسلم سوشلسٹوں اور نیشنلسٹوں کو چھوڑ کر جو اسلامی اُصول و آئین کو دفتر پارینہ سمجھ کر "غرقِ مے ناب" کر دینا چاہتے ہیں یا اُن چند افراد سے قطع نظر کر کے جو تجدد و انتہا پسندی کے شوق میں زمانہ کی رَو کے ساتھ بہتے رہنا ہی باعثِ فخر سمجھتے ہیں، باقی تمام مسلمان اِس قسم کی نیشنلزم کو قبول کرنے کے لیے نہ تیار ہیں نہ ہونگے۔ اور نہ ہو سکتے ہیں مولانا ابُوالکلام آزاد اِس وقت مسلمانوں میں سب سے زیادہ ممتاز و راسخ العقیدہ کانگرسی ہیں اور گزشتہ ۳۰ سال سے آج تک ایک لمحہ کے لیے بھی انہوں نے کانگرس سے علیحدگی اختیار نہیں کی۔ لیکن پھر بھی وہ صرف دفاعی نیشنلزم کے قائل ہیں۔ ہندوستان کے تعمیری اور اصلاحی نظام میں ہندو مسلمانوں کو از روئے معاشرت و تہذیب ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مدغم کر دینا کہ مسلمانو کی جُداگانہ ملّی حیثیت فنا ہو جائے، مولانائے ممدوح کے نزدیک بھی صحیح نہیں ہے۔ یہی حال جمعیتہ علمائے کے اُن مقتدر ارکان ہے جو کانگرس کی حمایت میں سب سے زیادہ بلند آہنگی کے ساتھ پیش پیش ہیں۔ علاوہ ازیں عام کانگرسی خیال کے مسلمانوں کا بھی یہی نقطۂ نظر ہے ——

لیکن افسوس ہے کہ اس کے باوجود آج تک اُن حضرات نے کبھی اِس پر غور نہ کیا کہ موجودہ تبدیل شدہ حالات میں اُنکا عملی پروگرام کیا ہونا چاہیئے۔ انھوں نے کانگرس کی حمایت کا اعلان آج سے بیس پچیس سال پہلے اس زمانہ میں کیا تھا جب کانگرس خالص سیاسی جماعت تھی اور جب مسلمانوں کے جداگانہ تہذیبی و معاشی امتیازات کو متحدہ قومیت میں جذب کرنے کا نصب العین کانگرس کے سامنے نہ تھا۔ لیکن اب کرپلانی جی جیسی ذمہ دار شخصیت اس امر کی شہادت دے رہی ہے کہ جب سے گاندھی جی کانگرس کے سیاہ و سفید کے مالک ہوئے ہیں یہ صرف سیاسی انقلاب ہی نہیں چاہتی، بلکہ زندگی کے ہر شعبہ کو بھی وطنیت و قومیت کے اُصول کے بموجب تبدیل کر دینا چاہتی ہے۔ ان بزرگوں کو اپنے سابقہ عقائد و خیالات کی نئے سرے سے جانچ پرتال کرنی چاہیئے اور نئے ارادوں اور منصوبوں نے حالات میں جو انقلاب پیدا کر دیا ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے ہر چیز کا جائزہ لینا چاہیئے۔

آزادی

اب صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ "پہلے آزادی لے لو پھر مستقبل کے نقشے بنانا"۔ آزادی جتنی کچھ ملنا تھی مل چکی۔ اور ہندوستان کی عظیم اکثریت اُسے قبول بھی کر چکی۔ یہ خیال کہ فیڈریشن کے سوال پر کانگرس وزارتوں کو چھوڑ کر پھر انقلابی جد و جہد میں مصروف ہو جائیگی ایک خیال خام نظر آتا ہے اور پھر اگر ایسا ہو بھی جائے تب بھی یہ سوال اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے کہ مستقبل کے ہندوستان میں مسلمانوں کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کا نقشہ کیا ہوگا؟ اِس سوال پر غور کرتے وقت ہمیں محض پرجوش جذبات یا دور از کار موہوم تصورات سے کام نہ لینا چاہیئے۔ ہم کبھی فنا نہیں ہو سکتے۔ ہم تو نو کروڑ ہیں۔ ہم نے بدر و حنین میں کم ہونے پر بھی فتح پائی ہے۔ شمال میں اسلامی ممالک کا ایک لمبا سلسلہ یورپ و افریقہ تک چلا گیا ہے جو ہر وقت ہماری مدد کریگا..... اس قسم کی جذباتی یا افسانوی باتوں سے قوموں کی تقدیریں بگڑا ہی کرتی ہیں بنا نہیں کرتیں۔

پھر یہ صحیح ہے کہ کانگرس میں بائیں بازو کے نام سے جو جماعت بن رہی ہے وہ یقیناً آگے چلکر طاقت حاصل کرے گی اور انقلابی جد وجہد کے جس سر رشتہ کو وزارت پسندوں نے چھوڑ دیا ہے اُسے اپنے ہاتھ میں لے لیگی۔ لیکن اس جماعت کی انقلاب پسندانہ نکتہ چینیوں کو سُنکر ہمیں یہ بھُول نہ جانا چاہیئے کہ اسوقت جو کچھ ہو رہا ہے اُسے یہ جماعت ناپسند نہیں کرتی۔ بلکہ اس سے زیادہ کچھ اور چاہتی ہے بخلاف اسکے مسلمان موجودہ حالت کو ناپسند بھی کرتے ہیں، بایاں بازو قومیت و وطنیت کے مسئلہ میں گاندھی جی سے سو فیصدی متفق ہے۔ اس بارہ میں اُسکا نظریہ بالکل وہی ہے جو گاندھی جی کا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ موجودہ اختیارات کو ادھورے سمجھ کر زیادہ وسیع اختیارات چاہتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ ان اختیارات کے ملجانے پر اُسکا عمل بھی بجنسہٖ بعینہٖ وہی ہوگا جو آج دائیں بازو کا ہے۔

مسلمانوں کا نقطۂ نظر

مسلمان کانگرس میں کیوں نہیں آتے؟ ہم اس سوال کے جواب میں اکثر یہ کہا کرتے ہیں کہ ــــــ مسلمان بےحس ہیں، جاہل ہیں، سیاست سے نا آشنا ہیں، اب تک صرف مذہب کے نام پر اُبھارے گئے ہیں، اس لیئے آج بھی یہی چاہتے ہیں، اُنکے لیڈر مکار و غدار ہیں، وہ انہیں مذہب کے نام پر دھوکا دیکر اپنا اُلّو سیدھا کرتے رہتے ہیں، مسلمان ہندوستان کو اپنا وطن نہیں سمجھتے، وہ ہر وقت ایران و عرب کے خواب دیکھتے رہتے ہیں، وہ واقعات کی دُنیا کے بجائے خیالی دنیا میں بسنا چاہتے ہیں اُنھیں پان اسلامزم (اخوتِ اسلامیہ) نے غلط توقعات دِلا رکھی ہیں، وہ انگریز کو اپنا مددگار سمجھتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ اگر ان تمام باتوں کو صحیح مان لیا جائے تو سوال یہ ہے کہ ہمارے لیڈروں نے اب تک ان کی اصلاح کیوں نہ کی ؟

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں !
گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا ؟

اگر واقعی مسلمانوں کے کانگرس میں نہ آنے کی وجہ صرف اسی قسم کے چند غیر حقیقی اسباب ہوتے تو اُنکا دُور کر دینا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ لیکن جب ایسا نہیں ہے تو پھر موجودہ حالات کا کوئی نہ کوئی حقیقی سبب تو ہونا چاہیئے ۔

دِل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش
گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا ۔

ہمیں اس بات کو تسلیم کرنے سے ہرگز انکار نہیں ہے، کہ کانگرس یا کانگرسی حکومتیں مُسلمانوں کے مذہبی معاملات میں مداخلت کرنا نہیں چاہتیں اور اس لیے وہ لوگ یقیناً جھوٹے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ کانگرسی حکومتوں میں مسلمانوں کو نماز پڑھنے، اذان دینے، قرآن کی تلاوت کرنے یا اسی قسم کے اور مذہبی معاملات کو بجالانے میں دقتیں پیدا کی گئی ہیں یا آئندہ کی جائیں گی۔ اصل سوال یہ ہے کہ آیا از روے معاشرت، تہذیب و تمدّن اور سیاست و اخلاق مسلمان ہندوستان میں اس طرح ایک قوم بنکر رہیں جیسے انگلستان میں یہودی اور عیسائی رہتے ہیں یا اپنی تمام موجودہ امتیازی خصوصیتوں کے ساتھ اس طرح رہیں جیسے کناڈا میں انگریز و فرانسیسی رہتے ہیں یعنی آیا وہ ہندوؤں کے ساتھ معجون مرکب بنکر ایک ہو جائیں یا اپنے تمام امتیازات کو باقی رکھتے ہوئے اُنکے ساتھ صرف اتحاد و اشتراک کے پیوند سے منسلک ہو کر رہیں؟ سوال کی اصلی اور حقیقی نوعیت صرف یہی ہے اور ہمیں صرف اسی پر غور کرنا چاہیئے ۔

اتحاد کے امکانات

لیکن اِسوقت صُورتِ حالات یہ ہے کہ اتحاد کے امکانات ایک ایک کرکے ختم کیے جارہے ہیں اور مسلمانوں کو صرف ادغام کی دعوت دی جارہی ہے۔ کبھی اُنہیں معاشی پروگرام کے نام پر بُلایا جاتا ہے اور کبھی روٹی کے سوال پر، کبھی لینن کے اُصول دکھلا کر اور کبھی مارکس کا نام سُنا کر۔ حالانکہ ؎

ستائش گر ہے زاہد اسقدر جس باغِ رضواں کا!
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

اور پھر مسلمان سب کچھ ہوسکتا ہے بشرطیکہ ان اصلاحات وانقلابات کا قلم اُس کی قدیم روایات وتاریخ کی شاخ پر نصب کیا جائے۔ لیکن یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ ماضی سے یکسر بے تعلق ہوکر صرف رامائن ومہابھارت کی زمین پر اپنی عمارت قائم کرنے پر وہ راضی ہوجائے۔

بہرحال اِس وقت سوال یہ ہے، اور یہ سوال کوئی ایسا سوال نہیں جو صرف آج پیدا ہورہا ہے، دُنیا میں جہاں کہیں اس قسم کے حالات پیدا ہوئے ہیں، وہاں ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا گیا ہے۔ کناڈا، سوئٹزرلینڈ، اور رُوس وغیرہ کی پچھلی ایک صدی کی تاریخیں اس قسم کے حالات کو دُہرا چکی ہیں، بنابریں ہندوستان کے حالات کو آنکھیں بند کرکے انگلینڈ وامریکہ پر قیاس کرلینا اور پھر جمہوریت کا نام لے کر مسلمانوں کو اپنی ملّی ہستی فنا کردینے کی ترغیب دینا کبھی کارگر نہیں ہوسکتا۔ لیکن ہمیں اندیشہ ہے کہ عام کانگرسی مسلمانوں میں بالعموم اور علمائے کرام کے طبقہ میں بالخصوص بہت کم ایسے افراد ہیں جو مسئلہ کی اِس پیچیدہ وغور طلب نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اب اِس قسم کی سہل انکاری روز بروز نقصان رساں ہوتی جارہی ہے۔ مسلم لیگ نے ہندوؤں پر بے جا بانہ تبرا کرنے کی جو رسم ڈالدی ہے وہ اگرچہ مسلمانوں کے لیئے نقصان رساں ہے۔ لیکن پھر بھی انہیں اپیل کرتی ہے۔ اِسلیئے اِس وقت اِس بات کی سخت ضرورت ہے کہ کانگرس سے مندرجۂ ذیل باتیں طے کرائی جائیں

(۱) ہندوستان میں مسلمانوں کی تہذیبی اور معاشرتی حیثیت بالکل جُدا رہے گی اور متحدہ قومیت کے اُصول کے بموجب ہندوستان کی دوسری اقوام میں اُن کو مدغم نہ کیا جائے گا۔

(۲) آچاریہ جی کے بیان کردہ نیشنلزم کے بموجب ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کو ایک ہی فلسفۂ زندگی کی زنجیر میں نہیں جکڑا جائیگا بلکہ اُنکے ملّی وقومی امتیازات کو باقی رکھا

جائے گا۔

(۳) بجز دفاعی قومیت کے مسلمانوں کے وجود کو قریب قریب ایک جُدا قوم کے ہم پلہ سمجھا جائے گا۔ اور انکے ساتھ ادغام نہیں بلکہ اتحاد و اشتراک کا سلوک ہوگا۔ پھر صرف اس اعلان ہی سے کام نہ چلے گا بلکہ ضرورت اس کی بھی ہے کہ ہمارے کانگرسی لیڈران چیزوں پر کانگرس اور کانگرسی حکومتوں سے عمل بھی کرائیں تاکہ ذہنیت کی تبدیلی کا علم عوام کو ہو سکے"۔

یہ ہے وہ تبصرہ جو آچاریہ کرپلانی کے بیان پر معاصر مدینہ نے اپنی دو اشاعتوں میں کیا اس میں شبہ نہیں کہ آچاریہ جی کا بیان ہے ہی ایسا کہ جو شخص بصارت کے ساتھ کچھ بھی بصیرت رکھتا ہے وہ اربابِ کانگرس کے اصلی منصوبوں کے متعلق مزید دھوکے میں نہیں رہ سکتا۔ بایں ہمہ معاصر مدینہ مستحق تبریک ہے کہ اُسنے اظہارِ حقیقت میں اتنی جرات سے کام لیا۔ ورنہ مسلکِ قومیت پرستی کا تقاضا تو کچھ اس قسم کی مصلحت کوشی تھی جس کا ثبوت ہمارے بڑے بڑے نیشنلسٹ علما و زعماء کیطرف سے ایسے مقامات پر بالعموم ملا کرتا ہے۔ مثلاً آچاریہ جی کا بیان مسلم قومیت پرست حضرات میں سے ہر ایک کی نظر سے گزرا ہوگا۔ لیکن آقایانِ وارد ہا کی خوشنودی مزاج کا جذبہ کچھ اس انداز سے گلوگیر ہو رہا ہے کہ ان کی زبان سے ایک لفظ بھی اسکی نسبت نہیں نکل سکا۔

معاصر مدینہ نے اس بیان سے جو نتائج اخذ کیے ہیں اُن کی صحت میں کسے شُبہ ہو سکتا ہے لیکن ہمیں افسوس ہوا کہ اس مشکل کا جو حل اس نے تجویز کیا ہے وہ (اشربوا فی قلوبہم العجل) کے مطابق۔ کانگرسی دیوتاؤں کی اس عقیدت و محبت کا پردہ نہ ہوتا تو وہ دیکھ لیتا کہ جس طریقِ کار کیطرف وہ دعوت دے رہا ہے اس میں کس قدر اُصولی اور منطقی غلطیاں ہیں۔ مثلاً علاج یہ تجویز کیا گیا ہے کہ "کانگرس سے یہ طے کرا لیا جائے کہ ہندوستان میں مسلمانوں

کی تہذیبی اور معاشرتی حیثیت بالکل جدا گانہ رہیگی اور متحدہ قومیت کے اصول کے بموجب ہندوستان کی دوسری اقوام میں ان کو ضم نہ کیا جائے گا۔" اس کی بابت امور ذیل غور طلب ہیں :۔

(۱) اس تجویز میں یہ نہیں واضح کیا گیا کہ کانگرس سے یہ باتیں طے کون کرائے۔ ظاہر ہے کہ طے کرانے والے مسلمان ہونگے۔ تو سب سے پہلے ہمارے معاصر نے غیر محسوس طور پر اس حقیقت کا اعتراف کر لیا کہ کانگرس کسی غیر مسلم ادارہ کا نام ہے۔ ورنہ اگر کانگرس کو ایک مشترکہ ادارہ تسلیم کیا جائے اور اس میں سے ایک عنصر (مسلمان) اس سے الگ ہو کر کچھ شرائط طے کرنا چاہیں تو کانگرس اسوقت مکمل کانگرس نہیں رہے گی۔ بلکہ "کانگرس منفی مسلمان" ہو گی۔ لہذا یہ منطقی طور پر غلط ہے کہ "کانگرسی مسلمان کانگرس سے یہ شرائط طے کرائیں"۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسا کہا جائے کہ "فلاں سوسائٹی کے ممبروں کو چاہیئے کہ سوسائٹی سے فلاں فلاں شرط طے کرالیں۔ جب تک مسلمان کانگرس سے الگ نہیں ہوتے۔ اور کانگرس کو ایک غیر مسلم ادارہ تسلیم کیا جاتا۔ اس سے شرائط طے کرانے کا سوال بے معنیٰ ہے :۔

(۲) کانگرس اگر ایک مشترکہ ادارہ ہے تو اُس کی ہستی ہی متحدہ قومیت کے اصول پر قائم ہے آج کانگرس سے یہ حقیقت تسلیم کرا لیجئے کہ ہندوستان میں متحدہ قومیت نہیں بلکہ مختلف اقوام بستی ہیں۔ پھر دیکھئے کہ کانگرس کا وجود کس طرح ہوا میں غائب ہو جاتا ہے۔ یہی تو وہ مقام ہے جہاں پہونچکر کانگرس مسلم لیگ کے ساتھ سمجھوتہ کرنے سے رُک جاتی ہے۔

(۳) کانگرس سے مجوزہ شرائط طے کرانے کے لیئے کوئی مقابل کی جماعت ہونی چاہیئے نہ کہ افراد۔ مسلم قومیت پرست حضرات اپنے آپ کو کتنی ہی اہمیت کیوں نہ دے لیں یہ ظاہر ہے کہ ان کی حیثیت انفرادی ہے۔ جماعتی نہیں۔ مسلمانوں کی پوری جماعت (تھوڑے سے افراد کو چھوڑ کر) اُنکے مسلک کے خلاف ہے۔ اِس لیئے کانگرس سے اُنکا معاہدہ یا سمجھوتہ جماعتی حیثیت سے نہیں ہو سکتا۔ کانگرس سے معاملات طے کرنے کے لیئے نہایت ضروری ہے کہ :۔

(۱) کانگریس کو غیر مسلم ادارہ تسلیم کیا جائے اور

(۲) اُسکے مقابلہ میں مسلمانوں کی ایک جداگانہ غیر مخلوط جماعت ہو جس سے کانگرس سمجھوتہ کرے۔ پھر اور اس طرح

(۳) اِن دونوں جماعتوں میں من حیث الاقوام اتحادِ عمل ہو۔

یہی ہے وہ مسلک جس کی طرف ہم پہلے اُن سے دعوت دے رہے ہیں زیادہ نہیں تو کم از کم ہمارا وہ پمفلٹ ہی ملاحظہ فرمالیا جائے "جو مسلم لیگ کا بنیادی مطالبہ" کے عنوان سے بکثرت شائع ہو چکا ہے۔

(۴) معاصرِ مدینہ کو اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ "ایسے معاہدات کے لیے صرف اعلان ہی کافی نہیں" لیکن کافی کیا ہے؟ یہاں پھر معاصر موصوف نے یہ کہہ کر غلطی کھائی ہے کہ "ہمارے کانگرسی لیڈر کانگرس اور کانگرسی حکومتوں سے اسپر عمل کرائیں"۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ معاصر موصوف نے مسلم قومیت پرست حضرات کی کانگرس میں بے بسی اور بے وقعتی کا کس بُری طرح سے اقرار کیا ہے۔ یعنی اُنکے پاس کوئی ایسی قوت نہیں، جس سے وہ اپنے مطالبات منوا سکیں۔ اور معاہدات کی پابندی کرا سکیں وہ اپنے آپ کو کانگرسی لیڈروں کے رحم و کرم پر چھوڑتے ہیں اور ان سے درخواستیں کی جاتی ہیں کہ وہ کانگرسی حکومتوں سے اس بات پر عمل کرائیں تاکہ عوام کو اس تبدیلیٔ ذہنیت کا علم ہو جائے!

ہم معاصرِ موصوف کی خدمت میں باادب گزارش کرینگے کہ معاہدات کی توقیر منت و سماجت سے نہیں ہوا کرتی بلکہ اپنے اندر قوت پیدا کرلینے سے ہوتی ہے۔ اور قوت پیدا ہوتی ہے اپنی مرکزیت۔ اپنی اجتماعیت اور اپنی جداگانہ ملی تنظیم سے۔

(۵) معاصر موصوف نے یہ کہہ کر "مسلمانوں کے وجود کو قریب قریب ایک جدا قوم کے ہم پلہ سمجھا جائے"۔ ایک طرف اپنی قائم کردہ عمارت کو بنیادوں سے ہلا دیا۔ اور دوسری طرف غیر شعوری طور پر اس جذبۂ خوف کا مظاہرہ کیا ہے جو ہندوؤں کے سامنے اپنے آپ کو ایک

جُداگانہ قوم کی حیثیت میں پیش کرنے میں ہر قومیت پرست کے دل میں جاگزین ہے کیا معاصرِ موصوف کو مسلمانوں کے ایک مستقل۔ غیر مخلوط۔ پوری پوری جُداگانہ "قوم" کے وجود میں شبہ ہے؟ مسلمان قومیت پرست حضرات کی یہی ارتیابی کیفیت ہے جو اِن کو ہندوؤں کی غلامی سے نجات نہیں دِلاسکتی۔ اِن حضرات کو مُسلمانوں کی جُداگانہ ملّی حیثیت میں یقین نہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک افراد کو اپنے دعوے اور مسلک پر پُورا پورا یقین نہ ہو۔ قوم کا کوئی قدم آگے نہیں بڑھ سکتا ؎

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملّت ہے
یہی قوت ہے جو صُورتگرِ تقدیرِ ملّت ہے

---

(۶) سب سے بڑھ کر افسوسناک غلطی وہ ہے جو معاصرِ موصوف کو مولانا ابوالکلام آزاد کو "دفاعی قومیت" کے کھلونے سے لاحق ہوئی ہے۔ مولانا صاحب نے مسلکِ قومیت پرستی تو اختیار کرلیا لیکن چونکہ اِس مسلک سے اُنکا قلب کبھی ہم آہنگ نہیں ہوا۔ اِس لیئے وہ ضمیر اور مصلحت کی کشمکش کو ہمیشہ لفظی گورکھ دھندوں میں چھپانے کی ناکام کوشش کرتے رہتے ہیں اُن سے پوچھیے کہ یہ "دفاعی قومیّت" کس بلا کا نام ہے! سوال بالکل واضح ہے کہ ہندو اور مُسلمان دونوں باہمی ادغام سے ایک قومیّت کے رشتے میں پِروئے جاسکتے ہیں یا نہیں! اگر اس سوال کا جواب اُنکے نزدیک مثبت میں ہے تو یہی متحدہ قومیّت دفاعی بھی ہوگی اور جارحانہ بھی۔ اگر اسکا جواب نفی میں ہے تو ایسی قومیت نہ دفاعی ہوسکتی ہے نہ جارحانہ۔ اگر "دفاعی قومیّت" سے مطلب صرف اتنا ہے کہ انگریز کے مقابلہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ محاذ قائم ہو تو اُسے بیّن الاقوامی معاہدہ کہا جائیگا۔ نہ کہ "دفاعی قومیت"۔ گزشتہ جنگِ عظیم میں جب چند اقوام باہمی معاہدہ سے دوسری اقوام کے خلاف متحدہ محاذ قائم کیئے ہوئے تھیں تو ان معاہدا قوام کے اتحاد سے کون سی نئی "دفاعی قومیت" پیدا ہوگئی تھی! اِن معاہدا قوام کا

نام "دوّلِ متحدہ" تھا۔ اسی طرح اگر ہندوستان میں مسلمان ایک جُداگانہ قوم ہیں اور ہندو الگ قوم۔ تو اِن دونوں کے اتحاد سے انگریز کے خلاف جو متحدہ محاذ قائم ہوگا تو اسکا نام زیادہ سے زیادہ "ہندو مسلم متحدہ محاذ" ہوسکتا ہے نہ کہ "دفاعی قومیت"۔ قومیّت ہمیشہ باہمی ادغام سے اسوقت وجود میں آتی ہے۔ جب وہ مختلف اقوام جو اس متحدہ قومیت کے عناصر ترکیبی ہوں۔ اپنا اپنا جُداگانہ ملّی تشخص کھو دیں۔ اس کو اتحاد نہیں کہتے۔ بلکہ ادغام کہتے ہیں۔ اتحاد میں ہر قوم اپنا اپنا جُداگانہ قومی تشخص برقرار رکھتی ہے۔ لیکن یہ باتیں تو ہم اسے سمجھائیں جسے معلوم نہ ہوں جو سب کچھ جانتا بُوجھتا۔ دیدہ دانستہ چشم پوشی کرے۔ اُسے کون سمجھائے۔ سوتے کو جگانا آسان ہے۔ لیکن جو جاگتا آنکھیں بند کرلے اُسے کون جگا سکتا ہے۔ ورنہ کیا آپ باور کرسکتے ہیں کہ مولانا آزاد "قومیت" اور "اتحاد بین الاقوام" میں بھی فرق کرنا نہیں جانتے! وہ جانکر قومیت کا لفظ استعمال کرتے ہیں کہ اس سے ہندوؤں کا مطلب پُورا ہو جاتا ہے اور پھر اس کی تاویل سے مسلمانوں کو تھپکیاں دیکر سُلانا چاہتے ہیں کہ میرا مطلب متحدہ محاذ سے ہے، ادغام سے نہیں۔ چلیے!

گاندھی جی بھی خوش رہیں راضی رہے سرکار بھی

ہم اپنے معاصر موصوف اور اس طرح ہندوستان کے تمام مسلم قومیت پرست حضرات کی خدمت میں گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ اب جبکہ خود کانگرس کے اتنے بڑے ذمہ دار عہدہ دار کی طرف سے کانگرس کا نصب العین اور مسلک واضح الفاظ میں سامنے آچکا ہے۔ انہیں چاہیئے کہ حقائق کا مردانہ وار اعتراف کرتے ہوئے اپنی تبدیلیٔ مسلک کا واضح الفاظ میں اعلان کردیں اور یہ مسلک اسکے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ

(۱) مسلمانوں کی اپنی الگ غیر مخلوط جماعت ہو۔

(۲) اپنا جُداگانہ مرکز ہو۔

(۳) کانگریس کو غیر مسلم اِدارہ تسلیم کیا جائے۔

(۴) اِن دونوں جماعتوں میں من حیث الاقوام معاہدہ کرکے مشترکہ مقاصد کے حصول میں اتحاد و تعاون کیا جائے۔ اور

(۵) مسلمانوں کا نصب العین ہندوستان میں حکومتِ الٰہیہ کا قیام ہو۔

اگر باو نرسیدی تمام بولہبی ست

رُباعی

نِگاہِ تو عتاب آلود تا چند

بُتانِ حاضر و موجود تا چند

دریں بُت خانہ اولادِ براہیمؑ

نمک پروردۂ نمرود تا چند

(اقبالؔ)

حقائق و عبر

(۱) برطانوی سنگینیں اور اہمساکے پجاری

قارئین طلوع اسلام کو یاد ہوگا کہ جس زمانہ میں اسمبلی میں فوجی بل پیش ہوا ہے کانگرسی زعماء اور انکے خانہ زاد غلامانِ ازلی نے لیگ کے خلاف کس قدر قیامت برپا کر رکھی تھی اور یہ بھی یاد ہو گا کہ ہم نے طلوعِ اسلام میں فوجی بل کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا تھا جس میں بدلائل وبراہین ثابت کیا تھا کہ وہی ہندو جو مسلمانوں کو مُوردِ الزام ٹھہراتے ہیں اس چیز کو کبھی برداشت نہیں کر سکتے کہ مُلک سے فوجی طاقت کم کر دی جائے۔ لیگ کے خلاف اس شور و پکار سے اُنکا مقصد صرف اتنا تھا کہ مُلازمت کے دیگر شعبوں کی طرح فوج میں بھی ہندو عنصر کی اکثریت ہو۔ ہندوؤں کی اس تحریک کے بعد کئی ایک مواقع ایسے آئے۔ جہاں انکے یہ خفیہ ارادے جن کی طرف ہم نے اپنے مذکورہ صدر مضمون میں اشارہ کیا تھا طشت از بام ہو گئے آج کی صحبت میں ہم اِسی قسم کا ایک اور واقعہ درج کرتے ہیں۔

پچھلے دنوں حکومتِ ہند کے محکمۂ فوج نے ایک حکم نافذ کر دیا جس کا مقصد یہ تھا کہ اگر صُوبائی حکومتیں اپنے نظم و نسق کے قیام کے لیے، فوجی خدمات کے لیے درخواست کریں تو مقامی فوجی افسروں کو چاہیے کہ اُسکے لیے پہلے حکومتِ ہند کی اجازت حاصل کر لیں۔ معاملہ صاف تھا۔ اس پر کسی کو اعتراض کیا ہو سکتا تھا، لیکن کانگرس کے ترجمان "ہندوستان ٹائمز" نے اپنی ۲۳ جولائی ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں اس پر ایک لمبا چوڑا شذرہ لکھکر اپنے قلبی اضطراب کا بری طرح مظاہرہ کیا ہے۔ لکھا ہے کہ اس نئے حکم کی رو سے صوبائی حکومتوں کو رجو اہنسا کے ادنا

حقائق وعبر

(۱) برطانوی سنگینین اور اہمسا کے پجاری

قارئین طلوع اسلام کو یاد ہوگا کہ جس زمانہ میں اسمبلی میں فوجی بل پیش ہوا ہے کانگریسی زعماء اور انکے خانہ زاد غلامانِ ازلی نے لیگ کے خلاف کس قدر قیامت برپا کر رکھی تھی اور یہ بھی یاد ہوگا کہ ہم نے طلوعِ اسلام میں فوجی بل کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا تھا جس میں بدلائل وبراہین ثابت کیا تھا کہ وہی ہندو جو مسلمانوں کو موردِ الزام ٹھیراتے ہیں اس چیز کو کبھی برداشت نہیں کر سکتے کہ ملک سے فوجی طاقت کم کر دی جائے۔ لیگ کے خلاف اس شور وپکار سے انکا مقصد صرف اتنا تھا کہ ملازمت کے دیگر شعبوں کی طرح فوج میں بھی ہندو عنصر کی اکثریت ہو۔ ہندوؤں کی اس تحریک کے بعد کئی ایک مواقع ایسے آئے۔ جہاں انکے یہ خفیہ ارادے جن کی طرف ہم نے اپنے مذکورہ صدر مضمون میں اشارہ کیا تھا طشت از بام ہوگئے آج کی صحبت میں ہم اسی قسم کا ایک اور واقعہ درج کرتے ہیں۔

پچھلے دنوں حکومتِ ہند کے محکمۂ فوج نے ایک حکم نافذ کر دیا جس کا مقصد یہ تھا کہ اگر صوبائی حکومتیں اپنے نظم ونسق کے قیام کے لیے، فوجی خدمات کے لیے درخواست کریں تو مقامی فوجی افسروں کو چاہیے کہ اسکے لیے پہلے حکومتِ ہند کی اجازت حاصل کر لیں۔ معاملہ صاف تھا۔ اس پر کسی کو اعتراض کیا ہو سکتا تھا، لیکن کانگرس کے ترجمان "ہندوستان ٹائمز" نے اپنی ۲۳ر جولائی ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں اس پر ایک لمبا چوڑا شذرہ لکھکر اپنے قلبی اضطراب کا بڑی طرح مظاہرہ کیا ہے۔ لکھا ہے کہ اس نئے حکم کی رو سے صوبائی حکومتوں کو (جو اہنسا کے اوتار

گاندھی جی کے چیلوں کی حکومتیں ہیں، قیام امن میں سخت مشکلات پیش آجائیں گی۔ کیونکہ انہیں ضرورت کے وقت فوجی امداد فوراً حاصل نہیں ہوسکے گی اس کے بعد نہایت لجاجت سے دریافت کیا ہے کہ حضور! یہ تو فرمائیے کہ ہم سے آپ کو خدشہ کیا ہے جو اس طرح کی پابندیاں عائد کی جاتی ہیں پھر یہ لکھا ہے کہ ہم نے یہ بھی سنا ہے کہ یوپی میں چار فوجی چھاؤنیاں توڑ دینے کا ارادہ ہے اگر ایسا ہوا تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس صوبہ کی حکومت انتظام کس طرح قائم رکھ سکے گی۔

یہ ہیں اہمسا کے پرستار، عدم تشدد کے مجسمے۔ فوجی طاقت کے سب سے بڑے مخالف، اب آپ نے سمجھ لیا کہ برطانوی سنگینوں اور رام راج میں کیا تعلق ہے۔ کیا اس حقیقت میں اب بھی کوئی شبہ ہے جس کی طرف ہم نے اپنے پہلے پرچہ میں اشارہ کیا تھا کہ ہندو چاہتا ہے کہ گائے کے سینگ انگریز پکڑے رہیں اور دودھ ہندو دوہیں۔ اس چیز کے بتانے کی ضرورت ہی نہیں کہ یہ سنگینیں کن کے سینوں میں پیوست کرنے کے لئے طلب کی جاتی ہیں اس کا جواب کانپور، لکھنؤ اور بمبئی کے ان مظلوم مسلمانوں سے پوچھئے جن کے سینے اس لئے گولیوں سے چھلنی کردیئے گئے کہ وہ حکومت کے مظالم کے خلاف صدائے احتجاج کیوں بلند کرتے ہیں۔ اس ضمن میں سردار پٹیل کے یہ الفاظ فراموش کئے جانے کے قابل نہیں ہیں جو انہوں نے بھاؤنگر کے ریاستی باشندوں کی کانفرنس کے موقع پر ارشاد فرمائے تھے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ اگر مسلمان یہی کچھ کرتے رہے تو ملک میں خون کی ندیاں بہ جائیں گی۔

---

(۲) عوام یا لیڈر

لیگ کی طرف سے جب کوئی مطالبہ پیش کیا جاتا ہے تو اسے فوراً یہ کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے کہ یہ تو مسلمانوں کے چند خود ساختہ لیڈروں کے مطالبات ہیں مسلم عوام میں جائیے اور ان سے پوچھئے کہ وہ کیا چاہتے ہیں چنانچہ مسلم رابطۂ عوام (Mass Contact) تحریک کی بنیاد ہی اس دلیل پر تھی کہ مسلم لیڈروں کی رائے قابل وقعت نہیں ہوسکتی عوام کی رائے قابل اعتماد ہوتی ہے اور اسے کانگرس براہ راست معلوم کرے گی۔ یہ تو ہے ارباب کانگرس کا رویہ مسلمانوں کے متعلق خود اپنے ہاں کیا حالت ہے

یہ بھی سن لیجئے۔ یو پی اسمبلی میں ڈسٹرکٹ بورڈوں کے متعلق ایک مسودہ قانون کے ضمن میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر لکشمی پنڈت نے فرمایا کہ جب ہم "پبلک کی رائے" کہتے ہیں تو ضروری نہیں کہ اس کا مفہوم رائے عامہ ہی ہو، پبلک کی رائے سے حقیقی مطلب ان لوگوں کی رائے ہوتا ہے جو پبلک کی نمائندگی کرتے ہیں (ہندوستان ٹائمز ۲۳ جولائی ۱۹۳۹ء)

یعنی مسلمان لیڈروں کی رائے قطعاً قابل اعتنار نہیں کیونکہ وہ عوام کی رائے نہیں ہوتی لیکن ہندو لیڈروں کی رائے واقعی عوام کی رائے ہوتی ہے۔ بن آئی کی باتیں ہیں:۔

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔

---

(۳) کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

ہم متعدد بار لکھ چکے ہیں کہ گاندھی جی کبھی صاف صاف نہیں بتائیں گے کہ سوراج سے ان کا مفہوم کیا ہے، اور وہ صاف صاف بات کہتے کون سی ہیں؟ اول تو اس کے متعلق کہتے ہی کچھ نہیں لیکن اگر کبھی لب کشائی پر مجبور ہو جاتے ہیں تو کچھ اس انداز سے کہتے ہیں کہ

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

پچھلے دنوں نیویارک ٹائمز کے ایک نامہ نگار نے براہ راست سوال کر دیا کہ آزادی سے آپ کا مفہوم کیا ہے، اب سنئے کہ اس کا جواب کیا ملتا ہے۔ فرماتے ہیں۔ "آزادی سے میرا مفہوم یہ ہے کہ برطانوی قوت کو ہندوستان سے بالکل خارج کر دیا جائے" کتنا واضح جواب ہے لیکن اس پر یہ اضافہ بھی فرما دیا کہ "البتہ اس سے وہ اشتراک عمل خارج نہیں جو دو آزاد قوموں کے درمیان ہو سکتا ہے۔ اچھی بات! لیکن ابھی فقرہ مکمل نہیں ہوا وہ یوں ہوتا ہے" لیکن ضروری نہیں کہ یہ آزادی درجۂ نوآبادیات (Dominion Status) سے مختلف ہو" ابھی اور اضافہ ملاحظہ فرمائیے۔ "لیکن شاید ہندوستان جیسے ملک کے لئے جو جنوبی افریقہ، کنیڈا، اسٹریلیا وغیرہ سے مختلف واقع ہوا ہے درجۂ نوآبادیات

کی اصطلاح (Dominion Status) کچھ زیادہ خوشگوار نہ ہو۔ لیکن یہ اصطلاح بھی تو انگریزی دستور سیاسی کی طرح اپنے اندر بڑی لچک رکھتی ہے۔ ہاں اور اگر (Dominion Status) کی تعریف کچھ ایسی کردی جائے جو ہندوستان جیسے ملک پر بھی منطبق ہو سکے اور اگر ہندوستان اور انگلستان کے درمیان ایک باعزت معاہدہ ہو سکے تو میں لفظوں کے اختلاف پر جھگڑا نہیں کرونگا۔ اگر انگریز ارباب سیاست اس باعزت معاہدہ کے لیے (DominionStatus) کی اصطلاح استعمال کرنا پسند کریں تو یونہی سہی میں اس کی بابت جھگڑنا نہیں چاہتا " (ہریجن ۶ جون ۳۹ ص ۲۴)

معلوم نہیں کہ نامہ نگار صاحب اس سے کیا سمجھے ہوں گے لیکن ہم تو اس سے اتنا ہی سمجھ سکے ہیں کہ یہ پریشانیٔ افکار اگر گاندھی جی کی عمر کا تقاضا نہیں تو پھر یہ الفاظ ان کی اس سعی لاحاصل کی بری طرح غمازی کر رہے ہیں جو وہ اپنے دلی ارادوں کو مصلحت کوشی کے حلیمی پردوں میں چھپانے کے لئے صرف کرتے رہتے ہیں۔

غالباً گاندھی جی کے پیشِ نظر وہی "معاہدہ" ہے جس کی طرف پچھلے دنوں مسٹر ستیہ مورتی نے اپنی ایک تقریر میں اشارہ کیا تھا۔ فیڈریشن کے متعلق ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ "اگر فیڈریشن کانگرس کے سر تھوپ دی گئی تو کانگرس ہر ایک نشست پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے گی، تاکہ کوئی دوسری جماعت فیڈریشن کو چلا نہ سکے لیکن مجھے امید ہے کہ سلطنتِ برطانیہ کانگریس کے ساتھ ایسا سمجھوتہ کرے گی جس سے اس قسم کے تصادم کی ضرورت نہ پڑے۔" (اسٹیٹس مین ۷ جون ۳۹ ص ۱۸)

یہ ہیں مکمل آزادی کے مدعیان کے ارادے اور یہ ہیں اُن کی آرزوئیں +

---

(۴) مخلوط انتخاب

جو مسلمان حضرات "مخلوط انتخاب" کو مسلمانوں کے تحفظِ حقوق کا بہترین ضامن کہا کرتے ہیں وہ مسٹر ستیہ مورتی کے ان الفاظ کو غور سے سُنیں، انھوں نے اپنی محولہ بالا تقریر میں فرمایا:-

"اگر تمام جُداگانہ انتخابات منسوخ کردیے جائیں تو کانگرس - ہندوستان کے تمام گیارہ صوبوں پر قابض ہوسکتی ہے - اور پھر ہمارے اور "پورنیہ سوراج" کے درمیان کوئی شئے حائل نہیں ہوگی" (ایضاً)

مخلوط اور جُداگانہ انتخاب کے متعلق ایک قومیت پرست اخبار کا تبصرہ بھی ملاحظہ فرمایئے۔

"مشترک وغیر مشترک انتخاب کا سوال ہندوستان میں سب سے بڑا سوال ہے جو ہندو مسلمانوں کی باہمی منافرت کی پیدا وار ہے - آج تک ہندوستان کے کسی حصہ میں مشترک انتخاب کا کوئی تجربہ کامیاب نہیں ہوسکا۔ کلکتہ کارپوریشن میں عرصے سے مشترک انتخاب جاری ہے مگر تجربہ نے یہ ثابت کردیا کہ اس سے فرقہ وارانہ بداعتمادی روز بروز بڑھتی جارہی ہے" (مدینہ ۲۵ جولائی ۳۹ء)

ان اُمور کا اعتراف بھی ہے - لیکن بایں ہمہ کانگرس کی ہمنوائی بھی ہے -

(۵) ایک نیا خطرہ

مسلم لیگ ابھی بمشکل چند قدم چل سکی ہے کہ اسکے اندر بھی ان خطرات کے آثار شروع ہوگئے ہیں جو بڑی بڑی منظم جماعتوں کو تباہ کرکے رکھ دیتے ہیں - چونکہ ہماری سیاست کے ماخذ کتاب وسنت کے بجائے بالعموم دساتیرِ افرنگ ہیں - اس لیئے اُن کی دیکھا دیکھی لیگ میں بھی دایئں اور بایئں بازو کا شاخسانہ چھڑتا نظر آرہا ہے - ہمیں مولانا حسرت موہانی کے اخلاص اور جوشِ عمل کا اعتراف ہے لیکن قوموں کی تنظیم کے لیئے ان خصوصیات کے ساتھ ساتھ اصابتِ رائے اور استقلالِ مزاج کے جوہر بھی لابُد ہیں - جس نازک دَور سے آج مسلمانانِ ہند گزر رہے ہیں - اس میں ایسا اقدام جس سے ملّت میں انتشار و تشتت پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہو کسی صوُرت میں بھی مستحسن قرار نہیں دیا جاسکتا - اس لیئے مولانا صاحب کی یہ تحریک کہ لیگ میں ایک "بایاں بازو" پیدا کردیا جائے کچھ اچھے نتائج کی حامل نہیں ہوسکتی - ملتِ اسلامیہ کو اس سے کس قدر نقصان پہونچے گا - اس کا اندازہ صرف اِس امر سے لگایئے کہ مسٹر ایم - این رائے

جیسا شخص اس کی پُرزور تائید کر رہا ہے کہ لیگ میں مولانا صاحب کے مسلک کی پُرجوش حمایت کی جائے (نیشنل کال $\frac{8}{29}$ ۱۶) جس وقت یہ سطور ناظرین کے سامنے ہوں گی۔ لیگ کی مجلس عاملہ اس مسئلہ کے متعلق کچھ فیصلہ کر چکی ہو گی۔ لیکن ہم مولانا صاحب کی خدمت میں مفادِ ملتِ اسلامیہ کا واسطہ دیکر گزارش کرینگے کہ وہ وقت کی نزاکت کو اپنے جذبات کے سیلاب میں بہا کر نہ لے جائیں اور قوم کو مزید تشتت سے بچا لیں۔ اور لیگ کو اپنے معیار کے مطابق فعّال جماعت بنانے کے لیئے کوئی اور اقدام فرمائیں۔

ضروری اطلاعات

ان تمام حضرات کو جو اپنا فائل مئی ۱۹۳۸ء تا اپریل ۱۹۳۹ء مکمل کرنا چاہتے ہیں اطلاع دی جاتی ہے کہ متعدد اعلانات کے باوجود جون۔جولائی ۱۹۳۸ء اور جنوری ۱۹۳۹ء کے پرچے حاصل نہ ہو سکے۔ اس لئے اس فرمائش کو پورا کرنے سے ہم مجبور ہیں۔ اسی لئے دوسری جلد کے رسالے کافی مقدار میں زیادہ طبع کئے جاتے ہیں جو یکم مئی ۱۹۳۹ء سے شروع ہوتی ہے۔

رسالہ ہر ماہ کی پہلی کو نہایت پابندیِ وقت سے برابر شائع ہو رہا ہے۔ اس لئے رسالہ نہ ملنے کی اطلاع ہر ماہ کی دس تک دفتر میں پہنچنی چاہیئے۔ ورنہ تعمیلِ ارشاد سے ہم مجبور ہونگے۔ ڈاکخانہ کی بدنظمی کے باعث بعض حضرات کو تین مرتبہ رسالہ بھیجا گیا۔ اور آخر تک وہ شکایات تحریر کرتے ہیں۔

کیا آپ نے مسلم لیگ کا بنیادی مطالبہ سمجھ لیا ہے؟

اگر ایسا نہیں ہے تو دفتر سے جلد طلب فرمایئے۔ اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تحریک آزادی میں اشتراکِ عمل کی صحیح اسلامی شکل کون سی ہوگی۔ قیمت ۰ر صرف ڈاک ۰

خریدارانِ رسالہ سے گذارش ہے کہ وہ جواب طلب امور کیلئے اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور دیا کریں۔ ورنہ تعمیلِ ارشاد نہ ہو سکے گی۔ نمبر خریداری ہر پتہ کی چٹ پر درج ہوتا ہے۔

متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد صاحب

حضرت علامہ اقبالؒ کے نظریۂ قومیت کے جواب میں حضرت مولانا حسین احمد صاحب نے ایک پمفلٹ شائع کیا ہے چونکہ علامہ اقبالؒ کے انتقال کے چھ ماہ بعد یہ جواب منظرِ عام پر آیا ہے جسکے معنی یہ ہیں کہ حضرت مولانا نے نہایت غور و فکر کے بعد اسکو مرتب فرمایا ہے اسلیئے ضرورت محسوس ہوئی کہ ادارۂ طلوعِ اسلام کی طرف سے اسکا ایک مفصل جواب شائع ہو۔ یہ رسالہ "متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد صاحب" اسی کا مدلل اور مسکت جواب ہے، جس میں شرح و بسط کیساتھ مولانا مدنی کے دلائل کا جواب کتاب و سنت کی روشنی میں دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اسلام میں متحدہ قومیت کا تصور کیا ہے، اور فرنگی لغت میں اس کی کیا تشریح ہے، اسلام کا نظریہ، فرنگی یا یورپی نظریہ سے کس طرح متصادم ہوتا ہے مغرب کے ایجاد کردہ قومی تصور میں کیا کیا مفاسد پوشیدہ ہیں، یہ کتاب آجکل کے جملہ قومی و سیاسی مباحث کے لیئے قولِ فیصل کا حکم رکھتی ہے،

قیمت ۲ر علاوہ محصول

ناظم۔ طلوعِ اسلام بلیماران دہلی

طلوعِ اسلام

یعنی

ہیئت اجتماعیہ اسلامیہ کا ماہوار مجلّہ۔ جو اسلام کے جماعتی نصب العین کے مطابق مئی ۱۹۳۸ء سے شائع ہو رہا ہے۔

طلوعِ اسلام

کسی شخص کی ذاتی ملکیت نہیں ہے بلکہ تمام اُمتِ اسلامیہ کا مشترکہ پرچہ ہے اس کا

نصب العین

مسلمانوں میں جماعتی زندگی کا احیا قرآن کریم کے حقائق وعلوم کی اشاعت، سیاسیاتِ حاضرہ میں مسلمانوں کی صحیح اور سچی رہنمائی ہے۔

جو لوگ!

مغربی علوم وفنون سے مرعوب ہو چکے ہیں اُن کو یہ رسالہ بتائے گا کہ دُنیا خواہ کتنی ہی آگے نکل جائے قرآن کریم ہر زمانہ میں اُس سے آگے ہی نظر آئے گا۔

بلند پایہ مضامین!

کا اندازہ اِس سے لگایئے کہ اکثر مضامین کتابی شکل میں کئی کئی بار طبع ہو کر شائع ہو چکے ہیں۔ وہ سیاسیات حاضرہ میں مسلمانوں کا سچا رہنما، بہترین مشیر اور ان پر غور وفکر کی راہیں کشادہ کرنیوالا ہے۔

قیمت سالانہ پانچ روپیہ ۵ر

نمونہ مفت طلب فرما کر خریداری کا فیصلہ کیجیے! منیجر طلوعِ اسلام بلیماران دہلی

رجسٹرڈ ایل نمبر 4240

اُردو زبان کی نادر کتابیں

اندرونِ ہند نامور ترکی خاتون خالدہ ادیب خانم کی جدید تصنیف (INSIDE INDIA) کا بہترین ترجمہ جو مولوی سید ہاشمی صاحب نے بہت فصیح اور سلیس زبان میں کیا ہے۔ انھوں نے مختلف یونیورسٹیوں میں لیکچر دیئے اور اس مُلک کو خوب دیکھا۔ یہاں کے بڑے بڑے مُدبّرین سے مُلاقاتیں کیں۔ ان سب ملاقاتوں کا حال اور خاتون موصوفہ کے تاثرات اس کتاب میں ملاحظہ فرمائیے۔ قیمت مجلّد سوا تین روپے غیر مجلد تین روپے۔

اسٹینڈرڈ اُردو انگلش ڈکشنری یہ نہایت جامع اور مکمل ڈکشنری ہے اس میں تقریباً دو لاکھ انگریزی الفاظ و محاورات کی تشریح کی گئی ہے۔ اس میں ادبی مقامی اور بول چال کے الفاظ کے علاوہ ان الفاظ کے معنی بھی شامل ہیں جن کا تعلق علوم و فنون کی اصطلاحات سے ہے۔ قیمت سولہ روپے۔

اسٹوڈینٹس اُردو انگلش ڈکشنری یہ بڑی لغت کا اختصار ہے لیکن جامع ہے۔ طلبا، پروفیسران وکلاء اور ادبی ذوق کے حضرات کے اصرار پر اس کی قیمت بہت کم رکھی گئی ہے۔ ضرور ایک کاپی خریدیئے۔ قیمت پانچ روپے۔

حقیقتِ اسلام اس کتاب میں مصنف نے نہایت خوبی کے ساتھ موجودہ خیالات سائنس سے اسلام کی تطبیق اور اس کی صداقت کو بیان کیا ہے۔ یہ ایک نہایت دلآویز اور حکیمانہ استدلال سے پُر ہے۔ قیمت بارہ روپے۔

فہرست اور کتابیں طلب کرنے کا پتہ

بک ڈپو انجمن ترقی اُردو۔ اُردو بازار۔ جامع مسجد دہلی!

نوٹ:۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) کی تمام مطبوعات کی ہم نے تمام ہندوستان کے لیے سول ایجنسی لے لی ہے۔ لہذا انجمن کی کتابیں ہمیشہ ہم سے طلب فرمائیں۔ اردو کی بہترین ادبی، مذہبی، اور سیاسی کتابیں برائے فروخت موجود ہیں۔

Printed at the Jayyed Press, Delhi. Published by Z. A. K. from Tulue Islam Office, Delhi.